نسٹیئن

2016

جلد: 6

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

سرپرست

لیفٹیننٹ جنرل نوید زمان، ہلالِ امتیاز (ملٹری)، (ریٹائرڈ)
ریکٹر نسٹ

مجلسِ مشاورت

انجینئر محمد شاہد
پرو ریکٹر

ڈاکٹر آصف رضا
پرو ریکٹر

ڈاکٹر صفدر علی شاہ
ڈائریکٹر پبلشنگ اینڈ سٹوڈنٹ افیئرز

مدیر

احسان الحق ڈوگر
ڈپٹی ڈائریکٹر سٹوڈنٹ افیئرز

مدیر طلباء

اسد طارق، محمد عثمان اختر

ترتیب و تزئین: ندیم شہزاد
حافظ طارق جاوید

ناشر: پبلشنگ اینڈ سٹوڈنٹ افیئرز ڈائریکٹوریٹ
نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد
طابع: نسٹ پریس

ترتیب

اداریہ 5

روشنی

ایک اور سفر 7

عقل اور نقل 8

اوزار یا اقدار 9

فکر و نظر

علامہ اقبالؒ کا بے مثل کارنامہ 11

اس دریچے کو کُھلا رہنے دو 20

سائنس کی دنیا

ہم آتش فشاں کے بارے کیسے جان پائے 23

کمپیوٹرائزڈ الیکٹرومکینیکل انسان 41

صحت کی باتیں 43

سوچ کی لہر

چندا 45
سین شین 51
کھٹے انگور 53

منظومات

فاروق کیانی 55
دل موسم کی بات 56
تم ہی ہو 57

مزاح

متحرک ادب 59
چاچو کی ڈائری 61

اداریہ

ادب کا تعلق احساسات کی تلچھٹ سے ہے اور سائنس کا تعلق دماغ کی اختراعات سے عبارت سمجھا جاتا ہے۔ اب اگر یہ سمجھا جائے کہ ادب اس مقابلے میں سائنس سے مات کھا جاتا ہے تو یہ محض ہماری کج خیالی ہے کیونکہ دماغ کے بہت بڑے حصے کا تعلق احساسات سے ہے، انسان کی محسوسات ہی اس کے جینے کا انداز متعین کرتی ہیں۔ احساسات کی کہانی خاصی طویل ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سائنس کا ہاتھ ادب سے اوپر ہے اور ادب سائنس کی مرہونِ منت ہے تو آئن سٹائن جیسا زیرک سائنسدان، ادب کے زعیم ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سے ملنے پر کیونکر راضی ہوا۔ کیوں فلسفہ اور سائنس کو ایک مقام پہ اکٹھا ہونا پڑا؟ اِس کا جواب یہی ہے کہ سائنس اور ادب ایک دوسرے کی احتیاجات ہیں۔ جو چیز سائنس دان دیکھ نہیں سکتا، ادیب اپنے دل کی آنکھ سے محسوس کر سکتا ہے۔

اردو ادب نے جس طرح کے انمول نگینے دنیا کو عطا کیے، وہ ایشیا تو کیا شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان کا ادب پیدا کر سکا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے جو 20/19 کا شاعر ہے، زندگی کے ہر شعبے سے متعلق منظومات لکھ کر جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، اِس کی مثال دنیا کی کسی زبان کے ادب میں نہیں ملتی جبکہ عمومی طور پر یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ اُردو زبان میں فلسفیانہ شاعری غالبؔ کی دریافت ہے جو کہ انیسویں صدی کا شاعر ہے۔ اِس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان نے اپنے ارتقاء کے اوائل میں ہی اپنی وسعت اور اہمیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ آج بھی اگر ہم نظیرؔ کی فلسفیانہ منظومات پر نظر دوڑائیں تو ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور فنا اور بقا کی جنگ کی بازگشت دور تک سنائی دیتی ہے۔

نستیٔین کا کوئی بھی صفحہ اٹھا کر دیکھ لیا جائے ایک چیز جو صاف طور سے محسوس کی جا سکتی ہے کہ خواہ الفاظ کی کمی ہو لیکن جذبات کی ایک آتش ہے جو آخری صفحے تک تجسس کو مٹنے نہیں

دیتی۔ ہر سال تحاریر کا ایک پلندہ اور ہر تحریر ایک نئے جذبے کی عکاسی کرتی ہے، مزے کی بات یہ ہے کہ ان تحاریر کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی رسالے میں گنجائش نہیں اور ہر شعبے کا نسٹیئن رسالے میں موجود ہونا اس فیصلے کو مشکل تر کر دیتا ہے کہ کس تحریر کو شامل کیا جائے اور کسے رد کیا جائے۔

تجسس نے انسان کو چاند پر پہنچا دیا، آسمان سے باتیں کرتی ہوئیں عمارات کا معمار بنا دیا اور سمندروں کی تہہ تک پہنچا دیا۔ ہر انسان کے احساسات اُس کی میراث ہیں، یہ اُس کی ذات کا وہ حصہ ہے جو کبھی ناکارہ نہیں ہوسکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ترقی کے اس دور میں احساسات کی اس میراث کو ٹیکنالوجی کے ہاتھوں مجروح نہ ہونے دیا جائے۔ نسٹیئن نسٹ کے مستقبل کے ستاروں کی اس میراث کی جس طرح سے پاسبانی کرتا ہے اس کی مثال گزشتہ شماروں کا مطالعہ کر کے بخوبی دیکھی جاسکتی ہے اور یہ شمارہ بھی اِنہیں ستاروں کی جگمگاتی میراث سے مزیّن ہے۔

میں مشکور ہوں طالب علم مدیر لئیقہ عندلیب کا جس نے ''دی نسٹیئن 2015'' کی اصلاح کرنے میں میری بھرپور اعانت کی۔ میں خصوصی طور پر شکر گزار ہوں جناب اسلم بزمی اور صفدر علی خان کا۔ ان کی نگارشات نے اس شمارے کے حجم اور کوالٹی میں اضافہ کیا۔ ادیبہ رحمٰن نے بھی مسوّدہ پڑھا اور اس کی بہتری کے لئے گراں قدر تجاویز دیں۔ اُمید ہے آئندہ بھی وہ اس سلسلے کو جاری و ساری رکھیں گی۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اپنی آراء سے آگاہ فرما کر ''دی نسٹیئن'' کو بہتر بنانے میں ہماری معاونت فرمائیں۔

مدیر

ڈاکٹرشگفتہ نقوی

ایک اور سفر

ایئرپورٹ پر لمبی قطار ہے۔
ہرمسافر کوسواری کا انتظار ہے۔
ایک ہاتھ میں موبائل ہے وہ کان کے ساتھ لگا ہوا ہے دوسرا ہاتھ سامان (بیگ) کے دستے پر ہے۔
غالب نے فرمایا تھا:

نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں

لیکن اب یہاں دوسرا ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔
تبدیلی اور ارتقاء ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔
لباس نئی تہذیب کی انتہا کو چھو کر اب دوسری انتہا کی طرف رواں دواں ہے۔آپ چشم تصور سے دیکھ لیں کہ سر سے پاؤں تک جہاں جہاں آزادی کے جوجوگل ہائے نمایاں کھلا سکتی ہے وہ کھل گئے ہیں۔بے تکلفی،سادگی اور who cares? کا یہ عالم ہے کہ پاؤں میں قینچی والے ربڑ کے چپل......اس سے اوپر آزادی ہے پھر نیکر ہے یا پھٹی ہوئی جین ہے لیکن تنگی داماں کا یہ عالم ہے کہ ذرا کمر میں خم آیا تو جلد نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کر دیا۔
اس سے اوپر جو بھی کپڑا جس رنگ اور سائز کا ملا لٹکا لیا اور کپڑا کم ہی ملتا ہے بڑی کمی ہے۔اب تو معاملہ

”صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں“

والی حد سے گزر گیا ہے اب تو سب کچھ سامنے ہے۔یہ ظاہری حالت اتنی قابل رحم یا قابل افسوس نہیں ہے کیونکہ یہ عالم ظاہر ہے باطن کی حالت تو عالم الغیب ہی جانتا ہے لیکن غفلت ایسی ہے کہ ہم نے اندر کی کھڑکی بند ہی کر دی ہے۔نہ روشنی اندر جائے،نہ کھڑکا ہو نہ دھڑکا ہو۔باہر چیزوں کا میلہ اور ہر گھڑی زندہ رہنے کا ثبوت بھی دیتا ہے۔
مصروف رکھنا ہے مصروف رہنا ہے اور دکھانا ہے کہ ہمیں کسی کی پروا نہیں۔
ہم اپنی ذات میں مکمل ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔
مطلوب تو یہ کہ رواں دواں اس ہستی کو پکارنا چاہیے جس کے لمحہ بہ لمحہ احسان ہیں جس نے ہمیں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔
مسکراہٹ،محبت اور مہربانی کی عالمی زبان ہے۔
بس جہاز ہمیں لیے ہوا میں اڑ گیا،اس سفر کے لیے کتنے دن پلاننگ کی، ٹکٹ بنوایا۔سامان چیک کیا وقت پر آئے۔قطار میں لگے۔چیک اِن ہوا۔۔۔سفر شروع۔۔۔
سوچیں ایک اور سفر بھی کرنا ہے اس کے لیے تیاری ہو رہی ہے۔سامان چیک کر لیا ہے۔
ٹکٹ!
ارادہ،یاد،منزل کی تمنا۔
کیسی منزل ہوگی ہر سفر۔۔۔اس سفر کی یاد دلائے تو ہم غافل نہیں ہیں:

کام تو اتنا پڑا ہے وقت تھوڑا رہ گیا

زریاب حیدر C of E&ME

عقل اور نقل

پاکستان کے تعلیمی کلچر بالخصوص سرکاری سکولوں اور یونیورسٹیوں میں ہر طالب علم کو تعلیمی میدان میں ''عقل اور نقل'' میں سے ایک راستے کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان کے بیشتر تعلیمی اداروں میں دیکھا گیا ہے کہ طلباء کی اکثریت نقل کا راستہ اختیار کرتی ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی عزتِ نفس کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہماری خودی اور شناخت کا احترام ختم ہوتا جارہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں نقل کرنے والے کو عقلمند اور عقلمند کو بے سمجھ سمجھا جاتا ہے۔اسی نظریہ کے تحت پاکستان اور بالخصوص اپنے اردگرد کے تعلیمی اداروں میں شعور کو بیدار کرنے کے لئے طلباء اور اساتذہ کے لیے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ جب ایک طالب علم کمرہ امتحان کے تعلیمی معرکے میں اترتا ہے تو اس کے اندر ایک جنگ سی شروع ہوجاتی ہے اور یہ جنگ حقیقی خودی اور مصنوعی خودی کے درمیان ہوتی ہے۔آیئے ملاحظہ کیجئے۔

تمام طلباء کمرہ امتحان میں بیٹھ کر پرچہ حل کر رہے ہیں اور ممتحن نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ممتحن کسی کام سے کمرہ امتحان سے باہر جاتے ہیں تو طلباء کے لیے نقل کا راستہ کھل جاتا ہے۔ ایک طالب علم جو اپنی حقیقی خودی کو بھول گیا ہے، اپنے ساتھی سے کہتا ہے کہ مجھے سوال نمبر 5 کا جواب بتاؤ۔ اتفاق سے اس کا ساتھی طالب علم حقیقی خودی کا مالک ہوتا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے:

''عقل کا تقاضا ہے کہ جب تک ممتحن موجود ہے، نقل نہیں کرسکتے''

پہلا طالب علم پوچھتا ہے کہ بے وقوف ممتحن تو کمرہ امتحان سے باہر چلا گیا ہے تمہیں علم نہیں؟

دوسرا طالب علم کہتا ہے کہ اے میرے بھائی کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایک ممتحن اعلیٰ ابھی بھی ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہر وقت دیکھتا رہتا ہے' کائنات کی کوئی چیز اسے ہم سے بے خبر نہیں رکھ سکتی۔ بھلا میں کیسے قرآن کی اس آیت کو بھلا دوں کہ:

یآیها الانسان ماغرك بربك الكريم

(''اے انسان تجھے کس نے اپنے رب سے غافل کردیا'') اے میرے بھائی ہماری حقیقی خودی کا تقاضا ہے کہ ہم کسی لمحے بھی اللہ کو نہ بُھولیں کیونکہ اللہ کا فرمان ہے:

ولا تكونو كالذين نسوالله فانسٰهم انفسهم اولئك هم الفسقون (حشر:19)

(اے لوگوان لوگوں جیسے نہ ہوجانا جنہوں نے خدا کو بُھلا دیا ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ رحیم ان کی ''خودی'' کو بھلا دے گا اور یہی لوگ فاسق ہیں'') اے بھائی اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا پرچہ حل کرو۔

اتنے میں نگران واپس کمرہ امتحان میں آجاتے ہیں اور پہلا طالب علم ایک

گہری سوچ میں گم ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی وادی میں سفر کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے اندر شرمندگی اور رسوائی محسوس کرتا ہے اور اپنے ضمیر اور خودی کی دردبھری آواز سنتا ہے۔

''اے انسان! کیا تو بھول گیا ہے کہ تو اشرف المخلوقات ہے؟ کیا تو بھول گیا ہے کہ تجھے فرشتوں پر فضیلت عطا کی گئی ہے؟ کیا تجھے یاد نہیں کہ تو اللہ کا خلیفہ ہے؟ کیا تو بھول گیا ہے کہ گناہ ایسی جگہ سرزد کرو جہاں اللہ نہ ہو؟ کیا تو بھول گیا کہ تجھے اللہ نے عقل جیسی عظیم نعمت عطا کی ہے جو تجھے حق و باطل کی تمیز سکھاتی ہے؟ کیا اپنی ''عقل'' کو ''نقل'' سے آلودہ کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم بھول گئے ہو کہ ایسی کامیابی جو تمہیں اللہ سے دور کر دے وہ حقیقت میں ناکامی ہے؟ اے انسان یاد رکھو کہ جس نے اللہ کو پا لیا اس نے کچھ بھی نہ کھویا اور جس نے اللہ کو کھو دیا اس نے کچھ بھی نہ پایا۔

اے انسانو! یاد رکھو کہ نقل کے ذریعے تم دنیا میں تو عزت حاصل کر لو گے لیکن یاد رکھو کہ تم برے ہو اور لوگ تمہیں اچھا سمجھیں، روزِ قیامت اس کا شدید عذاب ہوگا۔

زریاب حیدر C of E&ME

اوزار یا اقدار

بعد از سلام دل چاہتا ہے کہ مجبور باپ اور معصوم پھول سی بیٹی کا درد بھرا واقعہ بیان کروں۔ دیکھتا ہوں کہ ایک غریب لوہار ہے جس کی دس سالہ معصوم بیٹی ہے۔ لوہار سارا دن لوگوں کے لئے اوزار تیار اور مرمت کرتا تاکہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکے۔ بیٹی اپنے بابا سے بے حد محبت کرتی۔ سکول سے واپس آتے ہی بابا کو سلام کرتی تو بابا بھی اپنا کام چھوڑ کر بیٹی کو گلے لگا لیتا۔ باپ بیٹی جوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے تو دن بھر کی تھکاوٹ اتر جاتی۔ ایک روز بیٹی اپنے بابا سے گفتگو میں مشغول تھی کہ ایک بوڑھی عورت آئی اور کہنے لگی کہ بھائی مجھے دو دینار کی سخت ضرورت ہے۔ آپ مجھ سے یہ خراب تالا دو دینار میں خرید لیجئے اللہ آپ کی مدد فرمائے گا۔ لوہار نرم دلی کے ساتھ اٹھا اور تالا غور سے دیکھا اور کہا کہ میری بہن اگر آپ یہ تالا مجھ سے مرمت کروالیں تو اس کی قیمت دو کی بجائے دس دینار ہو جائے گی۔ اور مرمت کرنے کی میری مزدوری دو دینار ہے تو آپ کو بجائے دو دینار دینے کے آٹھ دینار دے دوں گا۔ بوڑھی عورت بہت خوش ہوئی اور دعائیں دینے لگی اور پھر لوہار سے سوال پوچھا کہ بھائی اگر آپ چاہتے تو مجھے آٹھ دینار دینے کی بجائے دو دینار بھی دے سکتے تھے کیونکہ میرے خراب تالے کی قیمت تو صرف دو دینار تھی۔ تو اس پر لوہار اطمینان سے بولا اے بہن: امیر وہ نہیں جس کے پاس رزق ہے بلکہ امیر وہ ہے جس کے ساتھ رازق یعنی اللہ ہے۔ اگر میں آپ کو دو دینار دے دیتا اور تالا مرمت کر کے چھ دینار خود رکھ لیتا تو ایسی صورت میں ضرورتِ زندگی تو حاصل کر لیتا مگر اے بہن مقصدِ زندگی کھو

دیتا۔اس کے بعد دردبھری آواز میں لوہار اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا کہ بیٹی یادرکھنا جس نے اللہ کو پالیا اس نے کچھ بھی نہ کھویا اور جس نے اللہ کو کھودیا اس نے کچھ بھی نہ پایا۔ بیٹی یادرکھو کہ دولت کی حقیقت اوزار کی طرح ہے، دولت اوزار میں نہیں ہے۔اوزار تو ضروریاتِ زندگی کے لئے ہوتے ہیں اور اقدار مقصدِ زندگی کے لئے۔اے بیٹی اپنے بابا کی اس بات کو دل میں بسالو کہ دنیا میں ضروریاتِ زندگی کو مقصد مت بناؤ کیونکہ ضروریاتِ زندگی کی مثال دریا کے پانی جیسی ہے اور مقصدِ زندگی کی مثال اس پانی پر چلنے والی کشتی کی۔جب تک مقصد کی کشتی ضروریات کے پانی پر رہتی ہے، اس وقت تک تیرتی رہتی ہے اور جب ضروریاتِ زندگی کا پانی مقصدِ زندگی کی کشتی میں آجاتا ہے تو مقصد کی کشتی ڈوب جاتی ہے۔

اے بیٹی مجھے معلوم نہیں کہ میں کب تک زندہ رہوں گا، لیکن جب تک زندہ رہوں گا ان شاء اللہ تمہاری تمام ضروریات پوری کرتا رہوں گا لیکن بیٹی یادرکھنا اگر میں اس دنیا سے چلا گیا تو پریشان نہ ہونا، مایوس نہ ہونا، اگر میں زندہ نہ رہا تو بیٹی ضروریات کی خاطر اپنا مقصد نہ بھلا دینا۔اوزار کی خاطر اقدار نہ بھول جانا۔اے بیٹی تم اب تھک چکی، کل سے تمہارا سالانہ امتحان بھی شروع ہے، تو خوب محنت کرنا اور خلوصِ دل سے اپنے رب کی رضا کی خاطر امتحان کی تیاری کرنا اور ہاں! ایک اہم بات یاد رکھنا۔اگر امتحان میں کوئی سوال حل نہ ہو رہا ہو تو اپنے بابا کی اس بات کو کبھی مت بھلانا کہ نقل والی کامیابی سے ناکام ہو جانا اللہ کو زیادہ پسند ہے۔بیٹی اب تم سو جاؤ تاکہ شام کو امتحان کی تیاری کر سکو۔

شام کے بعد رات آتی ہے تو ایک عجیب منظر دیکھتا ہوں کہ بیٹی اپنے بابا سے دردبھرے لہجے میں کہتی ہے کہ بابا! آج گھر میں صرف ایک شخص کا کھانا موجود ہے، آپ کھانا کھا لیجئے میں نے دوپہر کو پیٹ بھر کر کھا لیا تھا۔باپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور رو رو کے کہنے لگا: ''بیٹی جب تک میں زندہ ہوں، تمہیں بھوکا نہیں دیکھ سکتا۔بیٹی ایسا کرتا ہوں کہ وہ تالا جو بوڑھی عورت نے مجھے آٹھ دینار میں بیچا تھا، کیوں نہ اسے بیچ کر آج کا کھانا لے آؤں؟'' بیٹی نے خوشی سے جواب دیا'' بابا جان! میں تندور گرم کرتی ہوں آپ بازار سے آٹا وغیرہ لے آئیں۔'، باپ ابھی گھر سے باہر نہ گیا تھا کہ بیٹی کی چادر چولہے میں جل کر راکھ ہوگئی۔باپ کا کلیجہ پھٹنے کو آیا۔بیٹی کو بچایا، فوراً بازار گیا اور آٹے کی بجائے بیٹی کے لئے چادر لے آیا۔بیٹی نے پوچھا:'' بابا جان آپ آٹا نہیں لائے'' تو باپ نے آنسوؤں کے ساتھ جواب دیا:'' بیٹی، میں ایک دن کی بھوک برداشت کر سکتا ہوں مگر ایک لمحے کے لئے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری بیٹی چادر کے بغیر سکول جائے''۔

ایک بزرگ اپنا موبائل فون مرمت کرانے لے گئے۔

مکینک نے موبائل فون چیک کرنے کے بعد کہا کہ ''یہ فون بالکل ٹھیک ہے بابا جی، اس میں کوئی نقص نہیں''۔

بزرگ قدرے مایوسی اور آہستہ سے بولے:

''تو پھر بچوں کی کال کیوں نہیں آتی''؟

ممتاز اقبال ملك

علامہ اقبالؒ کا بے مثل کارنامہ

مفکرؒ، قانون دان اور فلسفی جناب اے۔کے بروہی (مرحوم) نے 21اپریل1968ءکو گورنمنٹ کالج لاہور کی ''مجلسِ اقبالؒ'' کے خصوصی اجلاس کی صدارت کی۔صدارتی خطبے کا مفہوم یہ تھا کہ علامہ اقبالؒ اسلام کے معروف شاعرفلسفی ہیں جن کی تحریریں ایمان افروزی، سرشاری اور جمالیاتی ساحری کا ایک لازوال سرچشمہ ہیں۔انہوں نے ہمیں قرآن کریم کے معانی سے آشنا کرنے کے ضمن میں بے مثال خدمات سرانجام دی ہیں اور حیاتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثال کا ایک ایسا شانداراور عالی شان جائزہ دنیائے آدم کے حضور میں پیش کیا ہے کہ جس کی روشنی میں ہم اس دنیا میں اپنی زندگیاں بہتر سے بہتر انداز میں بسر کرنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔بروہی صاحب نے اپنے خطبے میں علامہ اقبالؒ کی فکری اور سیاسی خدمات کا بھرپور احاطہ کیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے تاریخ اورزمینی وسیاسی حقائق کے گہرے مطالعے کے بعد مسلمانانِ برِصغیر کے لیے الگ وطن کی ضرورت اور حق کا مقدمہ تیارکیااور بڑی حکمت سے اسے عوام، خواص اور حکمرانوں کے ایوانوں میں پیش کیا۔ تاریخ میں اور بھی ایسے محسنوں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے اپنے قوم کی آزادی یا الگ وطن کا مطالبہ کیالیکن علامہ اقبالؒ کا بے مثل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کی منزل کے تعّین — برِصغیر میں مسلمانوں کے لیے آزاداور خودمختاروطن — اور قوم کو منزل پر جا پہنچانے کے لیے انتہائی موزوں قائد — محمد علی جناحؒ — کو تلاش اور قائل کرلیا۔قائداعظمؒ اس وقت لندن میں مقیم تھے۔(''دی گورنمنٹ کالج گزٹ''،30اپریل1968ء رپورٹ:م ام)

بروہی صاحب نے اُس روز جو کہا تاریخ، سفارت، سیاست اوروکالت کے حوالے سے کئی اورمدبّرین نے بھی مختلف مواقع پراس کی تائید کی اوراسے علامہ اقبالؒ کا بے مثل کارنامہ قرار دیا۔

علامہ اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی رکنیت اس وقت اختیار کی تھی جب وہ انگلستان میں قانون اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کررہے تھے اورلندن ہی میں تھے کہ ایک خاص روحانی تجربے سے گزرے۔اس تجربے کے کچھ الہامی اثرات مارچ1907ءمیں لکھی جانے والی ایک غزل میں موجود ہیں۔یہ علامہ اقبالؒ کی اردو کی اُن چندغزلوں میں سے ایک ہے جن پرعلامہ اقبالؒ نے ماہ وسال تحریر کیا یعنی مارچ1907ء۔غزل کے بعض اشعار :

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر اُستوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے رُوما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے مَیں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکُشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا
سفینۂ برگِ گُل بنا لے گا قافلہ مُورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا
مَیں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مِرا شعلہ بار ہوگا

(کُلیاتِ اقبالؒ، بانگِ درا،ص:140)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک یہ عالمِ بالا کی طرف سے عطا کردہ ایک مشاہدہ تھا۔اس راز سے انہوں نے دسمبر 1931ء میں پردہ اُٹھایا جب انہیں کیمبرج یونیورسٹی میں طلبہ سے خطاب کرنے کا موقعہ ملا۔علامہ اقبالؒ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن میں موجود تھے۔ کیمبرج میں زیرِتعلیم طالب علموں سے خطاب میں انہوں نے ان باتوں کا حوالہ دیا جن کا انہوں نے 1907ء میں اپنی غزل میں اعلان کیا تھا:

مَیں اُن نوجوانوں کو، جو کیمبرج میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں، چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ دہریت و مادیّت سے محفوظ رہیں۔اہلِ یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے مذہب اور حکومت کو علیحدہ علیحدہ کردیا۔اس طرح ان کی تہذیب روحِ اخلاق سے محروم ہوگئی۔اوراس کا رُخ دہریانہ مادیّت کی طرف پھر گیا۔میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی یہ خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق پیش گوئیاں کی تھیں۔میری زبان پر وہ پیش گوئیاں جاری ہوگئیں، اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہ سمجھتا تھا۔یہ 1907ء کی بات ہے اس سے چھ، سات سال بعد میری یہ پیش گوئیاں حرف بہ حرف پوری ہوگئیں۔1914ء کی جنگِ یورپ دراصل اہلِ یورپ کی اس غلطی کا نتیجہ تھی جس کا ذکر پہلے کرچکا ہوں یعنی مذہب اور حکومت کی علیحدگی اور دہریانہ مادیّت کا ظہور۔'' (رفیق افضل، گفتارِ اقبالؒ،ص254)

یہ بات یقینی ہے کہ علامہ اقبالؒ محسوس کررہے تھے کہ انہیں 1907ء میں ایک روحانی پیغام ملا تھا جو اس وقت خود ان پر بھی پوری طرح عیاں نہ تھا، اس کا بھرپور مفہوم ان پر بعدازاں جلوہ گر ہوا، لیکن اس پیغام کی صحت پر انہیں کامل یقین تھا۔ورنہ وہ اتنی زوردار شعری پیش گوئیوں کے روپ میں نہ ڈھلتا۔انہی اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ خود اپنے بارے میں بھی فیصلہ کرچکے تھے کہ انہیں امتِ مسلمہ کی راہبری کرنا ہے اور اسے غلامی کے تاریک تہ خانوں سے نکال کر آزادی کی روشن فضاؤں میں لا بٹھانا ہے۔

بروہی صاحب نے اپنے خطبے میں علامہ اقبالؒ کی ''زبورِعجم'' کے چند اشعار بھی پڑھے تھے۔بدقسمتی سے مَیں فارسی سمجھنے کی نعمت سے محروم ہوں۔مَیں نے استادِ گرامی پروفیسر محمد منوّر سے وہ اشعار اوران کے معانی بتانے کی درخواست کی۔انہوں نے ازراہِ کرم مجھے وہ اشعار اوراُن کے مفہوم کی املاء

(dictate) کرائی اور پھر میرے لکھے کو پڑھ کر ضروری اصلاح بھی کی۔(جو الحمدللہ اب بھی محفوظ ہے)مزید برآں چند کتابوں کے نام بھی لکھوائے کہ اُن کے مطالعہ سے حیاتِ اقبالؒ کا یہ پہلو دل و دماغ میں سما جائے۔فرمایا:

علامہ اقبالؒ کو یقین تھا کہ احیائے اسلام کی صبح طلوع ہونے والی ہے۔انہیں یہ بھی یقین تھا کہ انہیں احیائے اسلام کی ان مساعی میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا ہے جو مسلمانانِ برِعظیم کا طے شدہ مقدّر رہے۔حضرت علامہؒ کو اللہ کی مشیّتِ عظمٰی اور اس کی عنایت و امداد پر کامل بھروسا تھا۔چنانچہ انہوں نے قومی وجود میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایک نئی دنیا پیدا کردی۔انہوں نے اپنے سیاسی افکار کے لیے دو قومی نظریے کو بنیاد بنایا۔ علامہ شبلیؒ، سید امیر علیؒ، مولانا حسرت موہانی اور مسلمانانِ ہند کے دیگر مفکر و سیاستدان حضرات کی تعلیمات سے بھی فیض حاصل کیا۔ ہندوؤں کی باتیں سنیں اور انگریزوں کی بھی، اور ہوش و حواس کی زندگی کے چالیس سال کے عرصے میں ہندوستان کے پُر جوش منظر کا بھی مشاہدہ کیا۔آخر کار انہوں نے اپنی قوم کے لیے ایک منزل کی نشاندہی کردی اور انہیں اس کی طرف جانے والی راہ پر لگانے کی کوشش کی۔انہوں نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو قوم کی راہنمائی پر آمادہ کیا اور آزاد وطن کے حصول کا اصول قائداعظمؒ سے منوا لیا۔ یہ الگ بات کہ پاکستان بنا تو حضرت علامہؒ زندہ نہیں تھے۔قائد اعظمؒ کو راہبری کی ترغیب تو انہوں نے 1934-35 میں دی، مگر خود انہیں اس سے بھی بہت پہلے یہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قوم کو ایک خضرِ راہ سے نوازنے والا ہے۔

اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جن لوگوں کا زور گھٹایا جا رہا ہے، ہم ان پر احسان کریں، انہیں پیشوا بنا دیں، اور ان (ہی) کو (زمین کا) وارث بنائیں۔(سورۃ القصص، آیت:5)

ایسے اشارے ان کی بہت سی نظموں اور غزلوں میں موجود ہیں۔مثلاً ''زبورِ عجم'' کی ایک غزل۔(کلیاتِ اقبالؒ صفحہ 465)واضح رہے کہ ''زبورِ عجم'' 1928ء میں شائع ہوئی تھی:

خضرِ وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید بروں
کارواں زیں وادیٔ دور و دراز آید بروں

دشتِ حجاز سے مراد امتِ مسلمہ ہے۔خلوتِ دشتِ حجاز یعنی امتِ مسلمہ کا کوئی وطن جو مرکزِ حجاز سے ایک فاصلہ پر ہو، اچھے خاصے طویل فاصلے پر ہو۔معنی ہوا کہ ممالکِ اسلامیہ میں سے حجاز سے دُور ایک وطن کے اندر اس دور کا راہنمائے عالمِ اسلام رونما ہونے والا ہے۔دوسرے مصرع میں بات صاف ہوگئی کہ اس راہنما کی سرکردگی میں کارواں اس وادیٔ دُور و دراز سے روانہ ہوگا۔یعنی احیائے اسلام کی تحریک برِعظیم پاک و ہند کے شمالی خطوں سے کارفرما ہوگی۔

من بسیمائے غلاماں فرِّ سلطاں دیدہ ام
شعلۂ محمود از خاکِ ایاز آید بروں

یعنی میں نے غلاموں کے چہروں پر سلطانی ٹھاٹ جلوہ گر دیکھ لیا ہے۔ایاز کی مٹی سے محمودی شعلے پھوٹ رہے ہیں۔حضرت علامہؒ کی نگاہیں گویا صاف دیکھ رہی تھیں کہ ان کی قوم غلامی سے نکل

کر تختِ عزت پر جلوہ افروز ہونے والی ہے۔

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا زبزمِ عشق یک دانائے راز آید بُروں

یعنی طویل عرصے تک بلکہ زماں بعد از زماں، زندگی محرومیوں کا رونا روتی رہتی ہے۔ یہ رونا اللہ کی توحید پر ایمان رکھنے والے بھی روتے رہتے ہیں اور اللہ کے علاوہ خود ساختہ ''خداؤں'' کے سامنے سر نیاز جھکانے والے بھی۔ پھر عشقِ الٰہی سے سرشار افراد کی محفل میں سے ایک شخص اُبھرتا ہے جو مشیّتِ الٰہی کے اسرار سے آگاہ ہوتا ہے۔ گویا علامہ اقبالؒ یہ بتا رہے ہیں کہ بڑے طویل زمانے کے بعد ایک صاحبِ نظر شخص اللہ نے قوم کو عطا کر دیا ہے۔

طرحِ نَو می افگند اندر ضمیرِ کائنات
نالہ ہا کز سینۂ اہلِ نیاز آید بُروں

یعنی اہلِ درد کے سینے سے جو آہ و فغاں بلند ہو رہی ہے، وہ ضمیرِ کائنات کی لوح پر ایک نیا اصول نقش کرنے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان حملہ آور ہو کر ممالک فتح کرتے رہے یا حُسنِ کردار کی بدولت، لیکن اب کوئی نیا ہی اصول وجود میں آنے والا تھا۔ یعنی مسلمانوں کا حقِ استصوابِ رائے اور عددی کثرت کے بَل پر بعض خطّوں پر اپنی حاکمیت نافذ کرنے کا مطالبہ۔ یہ شعر قراردادِ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کو سامنے رکھے بغیر سمجھ نہیں آ سکتا۔ وگرنہ خالی ایک نئے اصول کا نفاذ کوئی واضح معنی نہیں رکھتا۔

یہاں قدرے مزید واضح کرنا لازم ہے کہ پروفیسر صاحب کس اصول کی بات کر رہے تھے؟

علامہ اقبالؒ کے ذہن میں مسلمانوں کے آزاد وطن کا تصور واضح تھا اور برِعظیم کے وہ خطے ان کے پیشِ نظر تھے جہاں مسلمان عدداً اکثریت میں تھے۔ لہٰذا ان خطوں میں آزادانہ حکومت کرنے کا حق رکھتے تھے۔ یہ اصولِ استصوابِ رائے دنیا میں پہلی بار مسلمانانِ برِعظیم نے استعمال کیا اور پھر اس سے بعض دیگر علاقوں کے مسلمانوں کو بھی حوصلہ ملا۔ مثلاً برِعظیم سے کچھ خطّے دوقومی نظریے کی بنا پر اور گنتی کی قوت کے باعث پاکستان کی آزاد مملکت کی صورت میں جلوہ گر نہ ہوئے ہوتے تو فلپائن کے مسلمان یہ مطالبہ نہ کرتے کہ جزیرہ منڈناؤ اور بعض دیگر جزیروں کو فلپائن سے علیحدہ اور خود مختار وطن بنا دیا جائے کیونکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اگر برِعظیم میں پاکستان نہ بنا ہوتا تو فلپائن کے مسلمان کس اصول اور کس نمونے کی روشنی میں ''اپنا پاکستان'' مانگتے۔ تھائی لینڈ کے بعض اضلاع میں مسلم اکثریت کبھی کبھی اپنے لئے وہی مطالبہ کرتی جو فلپائن کے مسلم اکثریتی علاقوں کے مسلمان کرتے ہیں۔ گویا تھائی لینڈ والے بھی فلپائن والوں کی طرح ''اپنا الگ پاکستان'' مانگتے رہے۔

مارچ 1907ء کی غزل میں بیان کردہ جذبات دسمبر 1930ء میں علامہ اقبالؒ کے خطبۂ الٰہ آباد میں نکھر کر سامنے آ گئے۔ یہ خطبہ مسلم لیگ کے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا۔ اس صدارتی خطبے میں علامہ اقبالؒ نے ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کا تصور یوں عطا کیا:

مَیں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتا ہوں جسے برطانوی شہنشاہی حدود کے اندر یا باہر حکومتِ خود اختیاری میسّر ہو۔ شمال مغربی ہندوستان میں ایک مربوط مسلم ریاست کی تشکیل میرے نزدیک کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا مقدّر دکھائی دیتی ہے۔

(سیّد نذیر نیازی، اقبالؒ کے حضور، ص 191)

یہ تصور رفتہ رفتہ جڑ پکڑنے لگا۔ ہوتے ہوتے یہ تصور شمال مغربی اور مشرقی مسلم اکثریتی خطّوں پر مبنی ایک مسلم ریاست کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اس سلسلے میں علامہؒ کا 21 جون 1937ء کا خط بنام قائد اعظمؒ بڑا واضح ہے۔ یہ خط علامہ اقبالؒ کی وفات سے دس ماہ پہلے لکھا گیا تھا:

> مسلم صوبہ جات کی علیحدہ فیڈریشن جو اِن خطوط پر از سرِ نو تشکیل دی جائے، واحد ذریعہ ہے ہندوستان میں امن و امان کے استحکام کا اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے سے بچانے کا۔ شمال مغربی اور بنگالی مسلمانوں کو کیوں نہ حقِ استصوابِ رائے کا مستحق جانا جائے جیسے ہندوستان کے اندر یا باہر دوسری قوموں کو جانا جاتا ہے۔ (شیخ محمد اشرف، لیٹرز آف اقبال ٹو جناح، ص 24)

ہندوستان کے اندر کا اشارہ ہندوؤں کی طرف ہے کہ اگر وہ ایک قوم کی حیثیت سے حقِ استصوابِ رائے کے اہل ہیں تو مسلمان کیوں نہیں۔ یہ رائے آج سکھ قوم پر بھی لاگو ہوسکتی ہے۔ کشمیری مسلمان 70 سال سے اسی حوالے سے آج بھی مصروفِ جدّ و جُہد ہیں۔

حمید نظامی اور آغا شورش کاشمیری جیسی ہستیاں رحلت کر چکی ہیں، ورنہ آج علامہ اقبالؒ کے ناقدین کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی کہ خطبۂ الٰہ آباد کے بعد علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے الگ وطن کے تصور کو ترک کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ تصور علامہ کی لوحِ ذہن پر ہمیشہ تازہ رہا۔ اس تصور کو رفتہ رفتہ پختہ ہونا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ مسلمانانِ برِعظیم اپنے لئے ایک آزاد وطن حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

21 مارچ 1932ء کو علامہ اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا جس میں ہندوستانی نیشنلزم کے تصور پر اپنا تبصرہ پیش کیا تھا اور مسلمانوں کی برِعظیم میں جو گت بن رہی تھی، اس پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ علامہؒ 1931ء کی لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کر چکے تھے اور بخوبی آگاہ ہو چکے تھے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے تعصّبات کتنے خطرناک ہیں اور ان کا رویّہ کتنا غیر روادارانہ ہے۔ وہ برطانوی حکومت کا ذہن بھی بخوبی جانتے تھے۔ انہوں نے اس خطبے میں اپنے خدشات کو دُہرایا اور مسلمانانِ ہند کے بارے میں تحفظات تجویز کئے:

> جہاں تک ہماری حکمتِ عملی کے بنیادی عناصر کا تعلق ہے، مَیں کوئی نئی شے پیش نہیں کر رہا۔ اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے مَیں نے اپنی آرا بالوضاحت بیان کر دی تھیں (اشارہ ہے خطبۂ الٰہ آباد کی طرف) آج کے خطبے میں یہ بات میرے پیشِ نظر ہے کہ میں دوسرے

امور کے علاوہ آپ کی مدد کروں کہ اولاً آپ اس صورتِ حال کو صحیح طور پر سمجھ سکیں جو ہمارے مندوبین کے ڈھلمل رویّے کے باعث گول میز کانفرنس کے آخری مرحلوں میں جلوہ گر ہوئی (ہمارے مندوبین سے مراد سارے ہندوستانی مندوبین) ثانیاً مَیں اپنے فہم وادراک کے مطابق یہ بتانا چاہوں گا کہ اب جبکہ برطانوی وزیرِاعظم نے لندن کی آخری کانفرنس میں اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے تو اس کی روشنی میں نئی حکمتِ عملی وضع کرنے کی کس قدر شدید ضرورت ہے۔ وزیرِاعظم کے اعلان کے باعث ضروری ہوگیا ہے کہ ساری صورت حال کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیا جائے۔ (بی اے ڈار' لیٹرز اینڈ رائیٹنگز آف اقبال۔ ص 70)

مولانا محمد علی جوہرؒ جنوری 1931ء میں فوت ہو گئے تھے اور دوسری گول میز کانفرنس کے بعد قائداعظمؒ لندن ہی میں ٹھہر گئے تھے۔ اب مسلمانانِ ہند کی سیاسی رہنمائی کا سارا بوجھ علامہ اقبالؒ کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ علامہ اقبالؒ کو اپنی قوم کے ایک چوکس نگہبان کا کردار کرنا پڑا تاوقتیکہ قائداعظمؒ 1935ء میں برِعظیم کی طرف واپس آ گئے۔

تیسری گول میز کانفرنس کے دوران لندن نیشنل لیگ نے علامہ اقبالؒ کو دعوتِ خطاب دی۔ اس اجلاس کے حاضرین میں غیر ملکی مدّبرین' دارلعوام کے ارکان' دارالامرا کے ارکان اور گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین بھی شامل تھے۔ اس اجلاس میں علامہ اقبالؒ نے وضاحت کی کہ وہ کیوں فرقہ ورانہ مسئلہ کا حل پہلے چاہتے ہیں اور دستوری اصلاحات بعد میں۔ انہوں نے صوبائی خودمختاری کی ضرورت پر اس لیے زور دیا' کہ صوبائی خودمختاری مسلم اکثریتی صوبوں کو کچھ اختیار دے دیتی تھی تاکہ وہ اپنے حقوق' تہذیبی روایات اور دین کا تحفظ کر سکیں۔ ہندو کی مرکزی حکومت کے زیرِ سایہ مسلمان اپنے تہذیبی اور دینی تشخص کو کھو بیٹھتے۔ اس لیے کہ مرکز میں حکومت کی غالب اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہوتی۔ انہوں نے خطبۂ الٰہ آباد میں پیش کی گئی اپنی آرا کا حوالہ دیا اور اپنے اس یقین کو پھر دُہرایا کہ جلد ہی افرادِ قوم ان کے نقطہ نظر کو قبول کرنے لگیں گے کیونکہ ان کا نقطہ نظر ٹھوس دلائل پر استوار ہے۔

برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لیے کوئی طریقہ یا منصوبہ چھان پھٹک کے بعد فیڈرل ڈھانچے کے ساتھ وجود میں آ جائے۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں کی انتہائی کوشش تھی کہ فقط صوبہ جات میں ذمہ دار حکومتوں کی تشکیل کے امکانات وضع کیے جائیں۔ دونوں کی خواہش تھی کہ مرکزی ذمہ دار حکومت کی تشکیل معرضِ التوا میں پڑی رہے۔ گویا یہ دونوں صاحبِ نظر آگے چل کر مسلمان صوبوں کی ہندو صوبوں سے علیحدہ فیڈریشن کے قیام کی توقع رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور علامہ اقبالؒ کے دسمبر 1930ء والی سوچ سے پیشتر تھا۔ شاید دوسرے مسلمان مندوبین یہ سمجھ ہی نہ سکے کہ اگر فیڈرل حکومت کے ڈھانچے کی تشکیل کو سرے سے نظر انداز نہ بھی کیا جائے اور کم از کم اسے معرض التوا ہی میں ڈال دیا جائے تو اس سے مسلم اکثریتی صوبوں کو کیا کیا مفادات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس امر کی طرف علامہ اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ مارچ 1932ء بمقام لاہور کے خطبۂ صدارت میں دکھ

بھرے انداز میں حوالہ دیتے ہوئے کہا:

فقط ایک چیز جو میرے لیے پُر اسرار رہے گی' وہ اعلان ہے جو 26 نومبر کو فیڈرل سٹرکچر کمیٹی میں شامل ہمارے ترجمانوں نے اس ضمن میں کیا کہ وہ بیک وقت صوبوں اور مرکز میں خودمختار اور ذمہ دار حکومتیں قائم کیے جانے کے اصول سے متفق ہیں۔ آیا ان کا یہ اعلان مصالحت پسندی اور ملک میں سیاسی پیش قدمی کے شوقِ بے پناہ پر مبنی تھا یا بعض متضاد اثرات ان کے دل و دماغ میں چھپے ہوئے تھے' مَیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(ایس اے واحد' افکارِ اقبالؒ' ص 369)

کارکنانِ قضاوقدر کا اپنا نظام ہے۔ فیڈرل سٹرکچر کمیٹی کوئی ٹھوس نتائج پیدا نہ کر سکی' لہٰذا ایکٹ 1935 کے تحت مرکزی حکومت کا قیام معرضِ التوا ہی میں رہا۔ ستمبر 1939 میں جنگِ عظیم دوم بھڑک اُٹھی جو 1945ء میں اختتام کو پہنچی' لہٰذا مرکزی الیکشن دسمبر 1945ء سے پہلے ممکن ہی نہ ہو سکے۔ صوبائی الیکشن 1946ء کے اوائل میں ہوئے۔ نتیجہ یہ کہ مرکزی حکومت کا اہتمام بھی 1937ء میں نافذ العمل ہو جاتا اور مرکز میں ایک نمائندہ ذمہ دار حکومت تقریباً نو' دس سال تک قائم رہ چکی ہوتی تو مسلمانانِ ہند کے لیے اور خصوصاً مسلم اکثریتی خطوں کے لیے حصولِ پاکستان میں کامیابی کی راہ دشوار تر ہو جاتی۔ مرکزی حکومت کی تنظیم کا ملتوی ہو جانا مسلمانانِ ہند کے لیے اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت و رحمت تھی۔ اس التوا کے باب میں علامہ اقبالؒ نے گول میز کانفرنس کے پسِ پردہ تبادلۂ خیال (بیک ڈور ڈپلومیسی) کے ذریعے بطورِ خاص زمین ہموار کی۔

25 مارچ 1940ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں یومِ اقبالؒ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ صدارت کر رہے تھے' سر عبدالقادر نے اپنی تقریر میں کہا: علامہ اقبالؒ کی اس دُنیوی زندگی کے آخری دن نیٹال (جنوبی افریقہ) کے ایک انگریزی اخبار کا تراشہ کسی نے علامہؒ کو بھیجا تھا' جس میں درج تھا کہ مسلمانانِ نیٹال نے ایک جلسہ کیا جس میں اقبال' جناح اور کمال اتاترک کی درازیِ حیات کے لیے دُعا مانگی گئی۔ جب علامہؒ کو یہ تفصیل پڑھ کر سُنائی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ مَیں تو اب اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔ مسٹر جناح کو ابھی اپنی زندگی کا مشن پُورا کرنا ہے' اس لیے مسلمانوں کو اُن کی درازیِ حیات کی دُعا مانگنی چاہیے۔

(محمد طاہر فاروقی' سیرتِ اقبال' ص 69)

علامہ اقبالؒ کے خدشات کی تصدیق ایکٹ 1935ء کے تحت ہندو صوبوں میں قائم ہونے والی کانگرسی وزارتوں نے کر دی۔ ان صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ نہایت بھیانک سلوک کیا گیا۔ اس افسوسناک صورتِ حال نے مسلمانانِ ہند کے مستقبل کے متعلق شکوک و شبہات میں مزید اضافہ کر دیا۔ واضح تھا کہ اگر ہندوستان متحد رہتا ہے تو مسلمانوں کا حشر کیا ہوگا؟ علامہ اقبالؒ نے اپنے ان خطوط میں جو انہوں نے 1936ء اور 1937ء میں قائداعظمؒ کے نام تحریر کیے' ایک آزاد مسلم مملکت کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا جو مغربی اور مشرقی خطوں پر مشتمل ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے بقا کی ضامن ہے۔

انہی ''نقاد'' حضرات کا موقف یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ ہندوستان سے باہر کوئی آزاد مسلم وطن طلب نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ تو انڈین یونین ہی کے اندر ایک مملکت کے طلب گار تھے۔ یعنی ایک مملکت ہی میں موجود دوسری

مملکت ۔ یہ موقف یا اندازہ سر بسر غلط ہے۔ علامہ اقبالؒ کے مفہوم سے ان کے مسلمان ہم وطن اور غیر مسلم بھی بڑی اچھی طرح آگاہ تھے۔ اسی لئے تو نہرو اور دیگر ہندو قائدین کو شدّ و مدّ سے دعویٰ کرنا پڑا کہ مسلم قومیت کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ نہرو نے کہا تھا:

> مسلم قوم کا تصور محض خواب و خیال ہے۔ اگر پریس نے اس تصور کو اشتہار نہ دیا ہوتا تو بہت کم لوگ اس کا نام بھی سن پاتے اور اگر بہت سے لوگوں کا اس امر پر یقین ہو بھی تو جب ذرا حقیقت کا لمس عمل میں آیا تو یہ تصور ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ (جواہر لعل نہرو، خود نوشت، ص469)

علامہ اقبالؒ کو قائداعظمؒ سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا—وہ قائداعظمؒ جنہیں علامہ اقبالؒ نے قوم کا واحد راہنما قرار دیا اور جو اُن کی نگاہوں میں اس دور کے خضرِ راہ تھے— قائداعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کے خطوط کا دیباچہ لکھا۔ یہ خطوط 1943ء میں شائع ہوئے، ناشر شیخ محمد اشرف تھے۔ اس کے دیباچے میں قائداعظمؒ اعتراف کرتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے اپریل 1938ء میں اپنی وفات سے پہلے ان سے مسلمانانِ ہند کے لیے ایک آزاد مملکت کے حصول کا اصول منوا لیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ اس دیباچے میں لکھتے ہیں:

> اقبالؒ کی آرا بنیادی طور پر میری آرا سے ہم آہنگ تھیں، آخرکار مجھے ان نتائج تک پہنچا کے رہیں جو ہندوستان کو درپیش دستوری مسائل پر گہرے غور و فکر کا نتیجہ تھیں، یہی فکری نتائج آگے چل کر مسلمانانِ ہند کے متحدہ عزم کے روپ میں واضح ہوئے اور پھر آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادِ لاہور میں بھی شامل ہو گئے۔

(شیخ محمد اشرف، لیٹرز آف اقبال ٹو جناح، ص6)

اس تحریر کی ابتدا میں جناب اے کے بروہی کے حوالے سے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ علامہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے قائداعظمؒ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی راہبری فرمائیں۔ امرِ حق یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے قائداعظمؒ کو اس دور میں زندہ و سلامت بڑے بڑے عظیم مسلمان قائدین کے ہوتے ہوئے ترجیح دی۔ اس وقت سر آغا خان، نواب محمد اسماعیل خان، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، نواب حمید اللہ خان والئی بھوپال، سر علی امام، مولوی تمیز الدین خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ مشرقی جیسے اکابر زندہ و سلامت تھے لیکن علامہ اقبالؒ کی نگاہِ دُور بیں قائداعظمؒ ہی پر ٹھہری۔ انہیں مسلمانوں کی رہبری کے لئے قائداعظمؒ ہی کی صورت میں خضرِ راہ نظر آیا جسے امتِ مسلمہ کی ہندی برادری کو منزلِ آزادی تک پہنچانا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کے نام ایک خط میں علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:

> مجھے معلوم ہے کہ میرا بار بار خط لکھنا آپ کو ناگوار نہیں گزرے گا۔ اس لئے کہ ہندوستان میں آج آپ واحد مسلمان ہیں جن پر نگاہیں مرکوز کرنے کا مسلمان قوم کو حق پہنچتا ہے تاکہ آپ ان کی راہبری فرما کر اس طوفان میں سے بخیر و عافیت نکال لے جائیں جو شمال مغربی ہند بلکہ سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔ (شیخ محمد اشرف، لیٹرز آف اقبال ٹو جناح، ص20)

اپنی وفات سے تین ماہ پہلے علامہ اقبالؒ نے انہی خیالات کا پھر اظہار

کیا۔سیّد نذیر نیازی اپنی کتاب ’’اقبالؒ کے حضور‘‘ میں لکھتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے بارے بعض اکابرین کے لب ولہجہ سے مایوسی چھلک رہی تھی۔اس پر علامہ اقبالؒ نے اظہارِ رائے کرتے ہوئے فرمایا:

سرِ دست ایک ہی صورت ہے۔مسلمانوں کو چاہئے کہ محمد علی جناحؒ کے ہاتھ مضبوط کریں۔مسلم لیگ میں شامل ہوجائیں۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اب جس طرح حل کیا جارہا ہے‘ اس میں ہمارا متحدہ محاذ ہی انگریزوں اور ہندوؤں کی مخالفانہ کارروائیوں کا واحد جواب ہے۔بغیر اس کے ہم اپنے مطالبات کیسے منوا سکتے ہیں؟لوگ کہتے ہیں ان مطالبات سے فرقہ واری کی بُو آتی ہے۔یہ محض پروپیگنڈا ہے۔ان مطالبات کا تعلق ہمارے قومی وجود کے تحفظ سے ہے‘ متحدہ محاذ مسلم لیگ ہی کی سربراہی میں قائم ہوسکتا ہے اور مسلم لیگ کامیاب ہوگی تو محمد علی جناحؒ کے سہارے۔ان کے سِوا اب کوئی شخص مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں۔(سید نذیر نیازی،اقبالؒ کے حضور،ص 297)

مطلوب الحسن سیّد اپنی کتاب ’’محمد علی جناحؒ۔اے پولیٹیکل سٹڈی‘‘ کے صفحہ 231 پر لکھتے ہیں کہ جب 24 مارچ 1940ء* کو قراردادِ لاہور منظور ہوگئی تو قائدؒ نے مجھ سے کہا:

اقبالؒ اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں۔آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ جان کر بہت خوش ہوتے کہ ہم نے بعینہٖ وہی کچھ کیا ہے‘ جو وہ چاہتے تھے کہ ہم کریں!

قیامِ پاکستان: 1912 کی پیش گوئی

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اِس قدر ہو گی ترنّم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفَس بادِ صبا ہو جائے گی!

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!

دیکھ لو گے سَطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی!

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!

نالۂ صیّاد سے ہوں گے نوا ساماں طیُور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی!

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہُوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

(کلیاتِ اقبال،ص:195-194)

---

*یہ قرارداد جو بعد ازاں قراردادِ پاکستان کے طور پر زباں زدِ عام ہوگئی‘ 23 مارچ 1940ء کو شیرِ بنگال مولوی فضل الحق نے پیش کی اور 24 مارچ 1940ء کو منظور ہوئی۔

عثمان خاور

اس دریچے کو کھُلا رہنے دو

ایک دریچہ کھلا ہے۔ تعفن اور سڑاند کے اس ماحول میں اسلم بزمی صاحب نے ایک دریچہ ہم پر وا کیا ہے جس میں سے اُجلے منظر بھی دکھائی دے رہے ہیں اور تازہ ہوا بھی داخل ہو رہی ہے۔ آنکھیں مل مل کر انسان سوچتا ہے ''کیا واقعی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب'' .... نہیں جناب! یہ کوئی واہمہ یا خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ ایک ٹھوس حقیقت۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ ہمارے اردگرد جہاں بے شمار سنگین اور دلخراش حقیقتیں بکھری پڑی ہیں، وہاں ایک خوشگوار حقیقت کو بھی قبول کر لیجئے، اگرچہ اس معاملے میں ہمارا ہاضمہ بہت کمزور ہے۔

''خاموش فلاح کار'' بزمی صاحب کی وہ تازہ تصنیف ہے جس میں بیان کردہ واقعات فی زمانہ ہزار داستان اور طلسم ہوش رُبا سے کم نہیں لگتے۔ کہا جاتا ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ یہ کتاب اس قول کی صداقت کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ اس کے ذریعے ہماری ملاقات ایک ایسے انسان سے ہوتی ہے جسے قدرت نے انسان دوستی ہی کے لیے پیدا کیا۔ محمود الحق علوی اُنگلیوں پر گنے جاسکنے والے اُن افراد میں شامل تھے جو پورے اخلاص کے ساتھ دوسروں کی مدد کرتے ہیں اور دوسروں ہی کے لیے جیتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر کو اس روشنی کی خبر اُس وقت ہوئی جب یہ آفتاب اپنی سنہری کرنیں سمیٹ کر ہمیشہ کے لیے اُفق کے اس پار غروب ہو گیا۔

2008ء میں جب ہم نسٹ کے نئے کیمپس H-12 اسلام آباد میں شفٹ ہوئے تو کشمیر ہائی وے پر کوئی پبلک ٹرانسپورٹ میسر نہ تھی۔ لیکن علی ٹرسٹ فری ٹرانسپورٹ کے نام سے کچھ گاڑیاں گاہے گاہے دکھائی دیتیں۔ دل پر ایک خوشگوار سا نقش بنا مگر پھر ہم روزمرہ کی ہماہمی میں مصروف ہو گئے اور روزانہ ان گاڑیوں کو سڑک پر حرکت کرتے دیکھنے کے باوصف کبھی زیادہ سوچا نہ زیادہ دلچسپی لی۔ ہمارے پاس ایسی چیزوں کے لیے وقت کہاں! پھر ایک روز بزمی صاحب نے بتایا کہ علی ٹرسٹ والے صاحب کو میں قریب سے جانتا ہوں۔ ان کے اور بھی بہت سے فلاحی ادارے مختلف شہروں میں ہیں اور یہ کہ یہ بڑے اخلاص والے آدمی ہیں اور خالص اللہ کی رضا اور اس کے بندوں کی محبت میں یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اس میں نام و نمود اور ریاکاری کا ذرا بھی دخل نہیں۔ یہ سُن کر حیرت سی ہوئی۔ اچھا! ایسا ہوتا تو نہیں مگر آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

اب جو قومی پرچم کے سفید اور سبز رنگوں سے مزین خوبصورت سرورق والی کتاب "خاموش فلاح کار" ہاتھوں میں آئی ہے تو حیرت بلکہ انتہائی خوشگوار حیرت ذہن و دل پر محیط ہو گئی ہے۔ اسے جہاں سے بھی کھولیں، تمام تفاصیل اس اجمال کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ یہ اُس مردِ خدا کا تذکرہ ہے جو جب تک جیا، مخلوقِ خدا کے درد میں جیا، اُن کی محبت اور اُن کی خدمت میں جیا۔ کہتے ہیں

ہر کہ خدمت کرد اُو مخدوم شُد

اُنہوں نے زندگی بھر انسانوں کی خدمت کی اور بدلے میں کسی چیز کی تمنا نہ کی۔ ہاں اب وہ اپنی محنتوں کا صلہ پانے کے لیے اس رب کے حضور حاضر ہو گئے ہیں جو سب سے زیادہ قدر دان ہے۔ کتاب کے سرِ ورق پر مسکراتا اُن کا چہرہ دیکھ کر اقبال کا یہ شعر بے اختیار لبوں پر پھسلنے لگتا ہے۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں
بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو
خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

مصنف نے اس کتاب کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً خاندان اور حالاتِ زندگی، حکاس کمپنی کا ترقیاتی سفر، علوی صاحب کے بارے میں نامور شخصیات کی آراء، ان کے تعمیر کردہ فلاحی اداروں سے وابستہ افراد کی آراء، ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کے احساسات اور اہلِ خانہ کے تاثرات۔ ان سب کے مطالعہ سے ایک ایسے شخص کا خاکہ ترتیب پاتا ہے جو صاف ستھرے کردار اور سچی اور کھری شخصیت کا مالک تھا۔ سیدھا چلنے والا۔ کاروباری معاملات میں بھی قول کا سچا دُھن کا پکا۔ اس نے بے داغ کردار اور اعلیٰ کارکردگی سے کاروبار میں قابلِ رشک مقام بنایا۔ آج اس میدان میں کتنے ہیں جو کامیابی کے حصول کے لیے ان اعلیٰ اقدار کو معیار بنانے کا حوصلہ رکھتے ہوں!

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

تاہم وہ میدان جس میں محمود الحق علوی پرچم تھامے سب سے آگے اور سب سے ممتاز دکھائی دیتے ہیں، وہ کاروبار کا نہیں انسانی ہمدردی اور فلاح کاری کا میدان ہے۔ اسی میدان میں وہ ہمیں جا بجا لوگوں کے دکھ بٹاتے اور ان کی زندگیوں میں آسانیاں بانٹتے نظر آتے ہیں، نہایت خاموشی اور نہایت اخلاص کے ساتھ۔ رازداری ایسی کہ دائیں ہاتھ سے دیں تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ نہ کوئی فوٹو سیشن، نہ تقاریر، نہ اخبار، نہ اشتہار۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ خیرات دینے اور ضرورتمندوں کی مدد کے معاملے میں ہمارا معاشرہ بانجھ نہیں۔ اپنی خامیوں کے باوجود ہمارے لوگ اس معاملے میں کشادہ دست ہیں۔ سو یہ بات حیرت کا باعث نہیں۔ ہاں مگر خدمت عامہ کا عمومی طریقِ کار جو ہمارے ہاں رائج ہے وہ ہے خوش حال لوگوں سے لے کر مفلوک الحال لوگوں میں بانٹ دینا۔ یقیناً یہ کام بھی محنت طلب ہے اور نیت خالص ہو تو یقیناً مستحسن بھی ہے۔ اگرچہ نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے اور اس بارے میں ہمارے لیے خوش گمانی لازم ہے۔ یہ بہرحال سامنے کی حقیقت ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے یہ وقت گزاری، امیج بلڈنگ یا ٹیکس میں چُھوٹ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی نیتیں خالص کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

علوی صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ اُنہوں نے جو دیا، اپنی جیبِ خاص اور اپنی حق حلال کی کمائی سے دیا اور کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے ہاں جیب سے دینے اور جیب میں باقی رکھنے کا تناسب کیا تھا؟ وہ اپنی آمدن کا تین چوتھائی ضرورتمندوں پر خرچ کرتے اور صرف ایک چوتھائی اپنی ضروریات کے لیے باقی رکھتے۔ پھر اس پر بھی وہ رازداری اور وہ انکسار جس کا پہلے ذکر ہو چکا۔ لا ریب یہ ایک درویش کی صفات ہیں جو دولت کو ہاتھ کا میل اور دنیا کو کُوڑے کا ڈھیر سمجھتا ہے اور اپنی تمام امیدیں اپنے

مالک سے وابستہ رکھتا ہے۔ ان کی درویشی کی مثالیں بے شمار ہیں اور کتاب میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ دوسروں کی ہمدردی، بھلائی اور اپنے آپ کو پس منظر میں رکھ کر ان کی مدد، کاروبار میں محنت اور وعدے کی بہرصورت تکمیل اور دولت کے ڈھیر میسر ہونے کے باوجود اہل خانہ کو اخلاقی اور معاشی طور پر منضبط زندگی کا خُوگر بنانا اور بچوں میں انکسار اور رواداری کی اعلیٰ اقدار کی ترویج کرنا۔ بڑوں کا احترام، خصوصاً ملازمین کے ساتھ احترام کا برتاؤ کرنے کی روایت ڈالنا۔ اُنھوں نے بچوں میں سادگی کو اس حد تک رواج دیا کہ ان کے اساتذہ اور ساتھی طلبہ وطالبات کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ یہ کسی متمول شخص کے بچے ہیں۔ غریبوں پر کروڑوں اربوں لٹانے والا اپنی ذات پر ایک روپیہ تک فالتو خرچ کرنے کا روادار نہ تھا۔ غیر معمولی امارت کا اظہار ان کی منکسر المزاج شخصیت سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ یہ سب چیزیں شخصیت کے ایک پورے پیکج کو ہمارے سامنے لے آتی ہیں اور ہم جان پاتے ہیں کہ ان کے لیے انسانی ہمدردی کوئی دکھاوا یا ظاہرداری نہ تھی۔ بلکہ یہ ان کی شخصیت کا جوہر تھا اور اس کی خوشبو نے ان کی شخصیت کا احاطہ کر رکھا تھا۔

ہم محمودالحق علوی صاحب اور ان کا خوبصورتی سے تعارف کرانے والے اسلم بزمی صاحب، دونوں کے شکرگزار ہیں کہ اس گئے گزرے دور میں انہوں نے اس معاشرے پر ہمارا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم علوی صاحب نے خدمت خلق کا جو پودا کاشت کیا، ان کے اہل خانہ اس کی آبیاری کرتے رہیں گے اور بے نوا انسانوں کے لیے اُمید کا جو دریچہ انہوں نے وا کیا ہے، اسے کبھی بند نہ ہونے دیں گے۔

مصنف :آئزاک اسیموو

مترجم: ڈاکٹر امجد علی بھٹی

ہم آتش فشاؤں کے بارے کیسے جان پائے

تھیرامیں دھماکہ

یورپ میں سب سے پہلی تہذیب نے ایجی آن کے علاقے میں نشو ونما پائی، جو دنیا کے نقشے پر یونان اور ترکی کے درمیان میں آباد جزیرہ ہے۔ اس خطے کا سب سے بڑا جزیرہ کریٹ ہے۔ ایجی آن کا رقبہ 3،189 مربع میل ہے، جو اِسے جزائر رھوڈس اور ڈیلاویئر کے علاقوں جتنا بڑا بناتا ہے۔ تین ہزار قبل مسیح میں کریٹ کے لوگوں نے دھاتوں کا استعمال شروع کر دیا تھا اور وہاں ایک منفرد تہذیب ارتقا پذیر ہو چکی تھی۔ کریٹ نے اپنے آس پاس کے علاقوں سے بہت کچھ سیکھا ہوگا کیونکہ اُن کی تاریخ کریٹ سے بھی کہیں زیادہ پرانی ہے۔ اِن علاقوں میں سے ایک مصر بھی ہے جو کریٹ سے چار سو (400) میل دور جنوب مشرق میں آباد ہے۔ چھ سو (600) میل مشرق میں کچھ دیگر جزائر بھی آباد تھے جنہیں موجودہ دنیا کے نقشے پر ہم لبنان، شام اور عراق کے ناموں سے جانتے ہیں۔

قدیم تہذیبیں اُن عظیم ملکوں میں پروان چڑھی تھیں، جہاں خشک زمین کی کوئی کمی نہ تھی۔ کریٹ پہلی جزیرہ تہذیب تھی۔ کریٹ والے سمندروں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے، اسی لیے وہ اپنی بحری فوج تیار کرنے والا پہلا ملک تھا۔ کریٹ کے جہاز اپنے ملک کو دشمنوں کے حملوں سے بچاتے تھے، جس کے باعث کریٹ کے عوام پُرسکون اور سکھ چین کی زندگی گزارتے تھے۔ انہوں نے عالی شان محلات تعمیر کیے جس میں پائپوں کے ذریعے دور سے پانی لانے کا انتظام تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کے فنکار تھے اور کھیلوں میں بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔

کریٹ کی باقیات میں سے ایک تصویر

کریٹ کے جہاز اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ بیوپار کے ساتھ ساتھ کریٹ کی تہذیب اور طرزِ زندگی بھی دیگر ملکوں کے علاوہ یورپ میں واقع یونان تک جا پہنچی تھی۔ کریٹ سے سو (100) میل شمال میں جزائر کا ایک مجموعہ ہے جو سکلڈ یز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سکلڈ یز ایک یونانی لفظ سے مشتق ہے اور اس کا مطلب دائرہ ہوتا ہے کیونکہ وہاں کے جزائر لگ بھگ ایک دائرے میں سجے ہوئے تھے۔ کریٹ کی تہذیب سکلڈ یز پہنچی اور اس سے وہاں کے لوگ بھی متاثر ہوئے۔ سکلڈ یز کے جنوب میں ایک جزیرہ تھا جسے قدیم یونانی تھیرو کے نام سے بلاتے تھے۔ آج اِسے تھیرا کہتے ہیں۔ زمانۂ وسطیٰ میں اٹلی کا جزیرہ ایجی آن پر قبضہ تھا۔ انہوں نے اِس کا نام سانتوہ رینی رکھا۔ اس نام کو لوگ آج بھی استعمال کرتے ہیں۔

دنیا کے نقشے پر تھیرا کا محل وقوع

تھیرا' کریٹ سے صرف پینسٹھ (65) میل دور ہے۔ 2000 قبل مسیح سے بھی پہلے کریٹ کے تمام جہاز تھیرا آیا کرتے تھے۔ تھیرا پانچ سو سال تک ایک امیر اور مہذب جزیرہ بنا رہا۔ آپ اگر آج تھیرا کو نقشے پر دیکھیں گے تو اِس کا حجم نصف دائرے جیسا دِکھائی دے گا اور اِس کا منہ مغرب کی جانب ہوگا۔ اس کا رقبہ قریب قریب تیس (30) مربع میل ہوگا اور وہ لگ بھگ منہاٹن جزیرے جتنا بڑا بنتا ہے۔ نصف دائرے کے اوپر اور نیچے کے کناروں کے بیچ کھلے حصے میں دو چھوٹے جزیرے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید کبھی تھیرا مکمل دائرے کی شکل کا رہا ہوگا' بالکل صفر کے سائز کا' مگر سمندر نے اس کا مغربی حصہ الگ کر دیا۔ اسی لیے وہاں اب صرف دائرے کے ٹکڑے باقی بچے ہیں۔ ٹوٹے دائرے کے مرکز میں دو جزیرے ہیں جن میں سے لگاتار دھواں نکلتا رہتا ہے جیسے اُن کے نیچے آگ جلائی گئی ہو۔

1966ء میں جب سائنس دانوں نے تھیرا میں کچھ جگھوں کی کھدائی کی تو وہاں انھیں ایک قدیم شہر کے آثار ملے۔ جو کریٹ کے زمانے میں بہت امیر اور مہذب رہا ہوگا۔ وہاں اُنھیں نہایت خوبصورت مٹی کے برتن اور دیواروں پر نقش و نگار بھی ملے۔ ماہرین کو وہاں ایک بھیانک دھماکے کے شواہد بھی ملے جو شاید 1500 قبل مسیح میں ہوا ہوگا۔ اُس وقت تھیرا پر ایک بڑا پہاڑ ہوا کرتا تھا جو جزیرہ ایجی آن کے پیندے سے اوپر اُٹھتا تھا۔ پہاڑ کا اوپری حصہ، جو سمندر کی سطح سے اوپر تھا، ایک دم گول تھا، اس لیے اس جزیرے کا سائز بھی گول تھا مگر یہ پہاڑ کوئی عام پہاڑ نہیں تھا۔ اس پہاڑ کی گہرائی میں بہت گرمی چھپی ہوئی تھی، جو کبھی اوپر کو اُٹھتی اور کبھی نیچے کی جانب جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس طرح کے پہاڑوں میں جب گرمی بہت بڑھ جاتی ہے، تو پہاڑ کے اندر کے پتھر پگھل جاتے ہیں۔ جیسے جیسے مزید پتھر پگھلتے ہیں۔ آہستہ آہستہ وہ اوپری سطح کے قریب آ جاتے ہیں۔ پھر شدید گرمی سے پہاڑ کی اوپری سطح پگھل جاتی ہے اور اس میں چھید (سوراخ) ہو جاتے ہیں۔ آخر کار ان سوراخوں میں سے لال گرم پگھلے پتھروں کی ندی باہر اُبل پڑتی ہے اور پہاڑ سے نیچے بہنے لگتی ہے۔

اِن پگھلے پتھروں کو ہم لاوا کہتے ہیں۔ لاوا ایک اطالوی لفظ ہے جس کا مطلب 'دھونا' ہوتا ہے۔ ابتدا میں اٹلی میں نیپلز شہر کے رہنے والوں نے بارش کو 'لاوا' کہہ کر بلایا کیونکہ اِس سے سڑکیں دُھل کر صاف ہو جاتی تھیں۔ پگھلے پتھر کی ندی پر بھی 'لاوا' کا لفظ بخوبی منطبق ہو جاتا ہے کیونکہ جب یہ گرم ندی بہتی ہے تو آس پاس کی تمام گھاس اور پیڑ پودوں کی دُھلائی ہو جاتی ہے۔

اس گرم لاوے کے بہنے سے خطرہ بھی ہو سکتا تھا۔ پہاڑ کی ڈھلان یا چوٹی پر بنے گھر پگھلے پتھر کی ندی سے تباہ ہو سکتے ہیں اور لوگ بھی مر سکتے ہیں۔ اکثر لاوا کے نکلنے اور بہنے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ اگر پہاڑ کی گہرائی سے پانی رِس کر اوپر آتا ہو تو اس کی شدید گرمی سے وہ اُبلنے لگتا ہے۔ پھر یہ سٹیم یا بھاپ زیادہ سے زیادہ دباؤ بڑھاتی ہے اور آخر میں اس کے دباؤ سے پہاڑ کا ایک حصہ ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔ اسے 'اریپشن' کہتے ہیں جو ایک لاطینی لفظ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے 'دھماکہ ہونا'۔ اس میں بہت بڑے بڑے پتھر ہوا میں اوپر اُچھلتے ہیں۔ راکھ اور گرم گیسیں بہت اونچائی تک اُٹھتی ہیں۔ آگ کی لپٹوں کے ساتھ ساتھ

بڑی تعداد میں گرم لاوا بھی باہر نکلتا ہے۔اس طرح کے کچھ پہاڑوں میں سے ہمیشہ ہی دھواں اور گرمی نکلتی رہتی ہے مگر کبھی کبھی صورت حال خراب بھی ہو جاتی ہے اور لاوا بہنا شروع ہو جاتا ہے۔

1۔تھیرا میں آتش فشاؤں سے تباہی

اس طرح کے پہاڑ زیادہ خطرناک نہیں ہوتے۔اگر ان میں سے کبھی کبھار لاوا رِس کر باہر نکلتا ہے تو اس میں دھماکہ ہونے کی اُمید کم ہوتی ہے۔چونکہ پہاڑ گرم ہوتا ہے، اس لیے لوگ اپنے آرام کے لیے اِس سے کافی دور پُرسکون جگہوں پر رہتے ہیں۔

اس طرح کے کچھ پہاڑ لمبے عرصے تک پُرسکون حالت میں رہتے ہیں۔تب لوگ انھیں کسی عام پہاڑ جیسا سمجھنے لگتے ہیں۔وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان میں سے کبھی لاوا بھی نکلا کرتا تھا۔ان میں سے جو پرانا لاوا نکلا تھا،اس سے زمین بہت زرخیز بن جاتی ہے۔اس سے وہاں پہاڑ کی ڈھلان پر بہت سے پودے اور پیڑ اُگ آتے ہیں اور پہاڑ ایک دم ہرا بھرا دکھائی دینے لگتا ہے۔ایسے پہاڑوں کی ڈھلانوں پر زمین کو لوگوں نے بہت زرخیز پایا ہوگا کیونکہ وہاں بہت اچھی فصلیں اُگتی تھیں لہٰذا وہاں لوگوں نے کھیتی باڑی شروع کر دی اور آس پاس اپنے گھر بھی بنا لیے۔ آہستہ آہستہ ایسے پہاڑوں کے آس پاس مکمل شہر بسنے لگے۔

اگر کسی دن وہ پہاڑ پھر سے گرم ہونا شروع جائے اور اس کی گہرائی میں بھاپ بننا شروع ہو جائے تو کیا ہوگا؟ یہ سب کچھ بھاری بھرکم پتھروں کے ایسے پہاڑ کے نیچے ہوگا، جو صدیوں پہلے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔اس سے آہستہ آہستہ دباؤ بڑھے گا،مزید بڑھے گا۔اگر پہاڑ اتنے سالوں تک ٹھنڈا نہ رہا ہوتا تو شاید دباؤ اتنا نہ بڑھتا مگر صدیوں کے بعد اس کا لاوا ٹھنڈا ہو کر اور جم کر اب ٹھوس پتھر بن چکا ہوگا۔اس لیے آخر کار اس میں ایک خطرناک دھماکہ ہوگا۔

پندرہ سو (1500) قبل مسیح میں تھیرا کے پہاڑوں میں دھماکہ ہوا تھا۔وہ پھٹا اور ایک اونچے بادل کے روپ میں اُس کا ملبہ (پتھر وغیرہ)، دھول اور راکھ آسمان پر چھا گئی۔پہاڑ کی جگہ پر اَب ایک بڑا گڑھا تھا۔اُس گڑھے میں فوراً سمندر کا پانی بھر گیا اور پہاڑ جس کی پہلے ایک ٹھوس گول شکل تھی، اب ٹوٹی ہوئی انگوٹھی جیسا دکھائی دینے لگا۔

تھیرا جزیرے کے سبھی باشندے اُس دھماکے میں یقینی طور پر مارے گئے ہوں گے۔دھماکے کی دُھول اور راکھ مشرق میں واقع کریٹ تک بھی جا پہنچی تھی۔اُس دھماکے سے سمندر کا پیندا ہلا اور اِس سے بڑی بڑی لہریں پیدا ہوئیں۔لوگوں نے اُسے جوار بھاٹے والی لہریں سمجھا مگر دراصل ان لہروں کا جوار بھاٹے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔اُس کا مناسب نام تھا 'سونامی' جو ایک جاپانی لفظ ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے 'بندرگاہ کی لہریں'۔ایسی لہریں جو سمندر میں بہت اونچی نہیں ہوتیں اور جب کسی بندرگاہ میں داخل ہوتی ہیں تو اُس کا سارا پانی ایک تنگ جگہ میں جا گھستا ہے اور وہ بہت اونچی ہو جاتی ہیں۔کبھی کبھی اِن لہروں کی اونچائی پچاس (50) فٹ سے بھی زیادہ اونچی ہوتی ہے اور سمندر کے کناروں سے ٹکرانے کے بعد ان لہروں میں ہزاروں لوگ ڈوب سکتے ہیں۔
کریٹ اور یونان کے سمندری کنارے اس سونامی سے بُری طرح برباد

ہوئے۔ کریٹ کے دارالحکومت ''نوس سوس'' کو بھی بھاری نقصان پہنچا اوراس حادثے میں تمام جزیرے کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ کریٹ کے لوگوں نے اس بھیانک حادثے کے بعد بھی اپنی روزمرہ کی زندگی جاری رکھنے کی ٹھانی مگروہ اس دھماکے سے خود کو کبھی سنبھال نہیں پائے۔ پچاس سال بعد پندرہ سو (1500) قبل مسیح میں یونانیوں نے کریٹ پر حملہ کردیا' وہاں کے شہروں میں آگ لگائی اور پوری تہذیب کو نیست و نابود کردیا۔ اگر تھیرا میں واقع پہاڑ میں دھماکہ نہ ہوا ہوتا تو شاید یہ تباہی کبھی نہ ہوئی ہوتی۔ یونانیوں میں اس دھماکے کی تھوڑی بہت یادیں باقی رہیں۔ ایک روایت کے مطابق اُن کے جزیرے میں ایک بار بھیانک سیلاب آیا تھا، جس میں صرف ایک ہی جوڑا زندہ بچا تھا۔

370 قبل مسیح میں عظیم یونانی فلسفی افلاطون (427-347 قبل مسیح) نے ایک خوبصورت شہر کا ذکر کیا تھا، جو ایک رات میں زلزلے میں تباہ ہوکر سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ اُن کے مطابق وہ شہر مغرب میں سپین سے بھی بہت دور تھا۔ انہوں نے اِس کا نام ایٹلناٹس لکھا ہے کیونکہ افلاطون کے بقول وہ اٹلناٹک براعظم میں واقع تھا۔ دو ہزار سالوں تک لوگ اس دیومالائی کردار کے سچ ہونے کے بارے میں محوحیرت رہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ بحراوقیانوس کے نیچے ایک ڈوبا ہوا بڑا جزیرہ ہے، جہاں کبھی کوئی عظیم تہذیب پروان چڑھی ہوگی۔ ممکن ہے کہ افلاطون نے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا ہو، جو یونان کے آس پاس ہی وقوع پذیر ہوا ہو۔ شاید یہ کہانی جزیرہ تھیرا میں ظہور پذیر ہوئی ہو جو کبھی ایک عظیم تہذیب تھی مگر وہ دھماکے کے بعد سمندر میں ڈوب گئی تھی۔

2: آتش فشاؤں سے جڑے ہوئے قدیم تصورات

لیپاری میں آتش فشاں کا منظر

تھیرا کوئی اکلوتا پہاڑ نہیں ہے جس سے دھواں اور لاوا نکلا تھا۔ بحیرہ روم میں واقع سسلی کے شمال میں بھی ایسے کئی جزیرے ہیں۔ اُن میں سے ایک لیپاری جزیرہ ہے، جو بالکل تھیرا کی طرح ہی سمندر کی تہ سے نکلے ہوئے لاوے کے ٹھنڈے ہوئے پتھروں سے بنا ہے۔ لیپاری جزیرہ کے جنوب میں واقع ''وُلکانو'' جزیرہ ہے جہاں پہاڑوں سے ہمیشہ دُھوئیں اور آگ کی لپٹیں نکلتی رہتی ہیں۔ ایسے کئی پہاڑوں کی طرح اُس کے منہ پر بھی ایک بڑی پرات جیسا گڑھا بنا ہوا ہے۔ اس طرح کے گڑھے کو 'کریٹر' کہتے ہیں جس کا لاطینی میں مطلب 'کپ' ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کریٹر میں لاوا لبالب بھر جاتا ہے اور پھر اس کی ایک دھار پہاڑ کی ڈھال پر سے نیچے کی جانب بہنے لگتی ہے۔ 1890ء میں آخری بار 'وُلکانو' پہاڑ پر لاوے کا زوردار اُبھار دیکھنے کو ملا تھا۔

ہمیں اس کے پس منظر کی وجوہات کا علم نہیں مگر قدیم اطالوی اور رومی خاص طور پر اِس جزیرے سے بہت متاثر تھے۔ آگ کے دیوتا قدیم دیومالائی زمانے میں بہت اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے، اس لیے اٹلی والوں نے اس دیوتا کا نام 'وولکن' رکھا۔ کسی کو یہ حتمی طور پر پتہ نہیں کہ آتش فشاں والے اس جزیرے کا نام دیوتا کے نام پر پڑا یا پھر دیوتا کا نام جزیرے کی وجہ سے پڑا۔ بعد کے زمانوں میں رومیوں کو "وولکن" بالکل یونانی دیوتا ہیپھائسٹس جیسا ہی لگا۔ ہیپھائسٹس لوہار خانے کا دیوتا تھا، جہاں وہ گرم دھاتوں سے الگ الگ اقسام کی چیزیں بناتا تھا۔

ہیپھائسٹس اور وولکن کی تصویر ایک لوہار جیسی ہے جو گرم بھٹی میں سے لال سرخ سونے، چاندی، تانبے، پیتل اور لوہے سے نہایت خوبصورت اوزار اور زیور بناتا ہے۔ ایسا خیال کرنا فطری ہوگا کہ ایسے دیوتا کا لوہار خانہ کسی گرم اور دھوئیں سے تپتے پہاڑ کے اندر واقع ہوگا۔ شاید وہ "وولکن" جزیرے پر واقع ہو۔ پہاڑ کے اوپر سے نکلتی گرمی اور دھواں "وولکن" کے لوہار خانے کی بھٹی میں سے نکل رہا ہو اور جب وولکن کا دھندہ اپنے عروج پر ہو تو شاید بھٹی کی آگ بہت شدید ہو جائے۔ اس سے پہاڑ کے اندر کے پتھر پگھل جائیں اور لاوا پہاڑ کی چوٹی پر سے بہنے لگے۔

اس طرح وولکن اور اس جزیرے کا نام اِس قسم کے پہاڑوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے منسوب ہو گیا۔ آج بھی آگ اور دُھواں اُگلتے پہاڑوں کو ہم 'وولکینو' یا آتش فشاں بلاتے ہیں۔ زمانہ قدیم کے لوگوں کو یقین تھا کہ آتش فشاؤں کے اندر مافوق الفطرت چیزیں رہتی ہیں اور اِس میں کوئی حیرانی والی بات بھی نہیں۔ ان آتش فشاؤں میں دھماکوں کے بعد نکلی آگ، لاوا اور دھماکے کے بعد آئے خطرناک زلزلے کوئی عظیم طاقت ہی پیدا کر سکتی ہوگی۔

ایٹنا کا آتش فشاں

زمانہ قدیم میں اسرائیل کے رہنے والے بھی آتش فشاؤں سے خوف زدہ رہتے تھے۔ مذہبی کتاب بائبل میں اِس کا ذکر موجود ہے۔ اسرائیلیوں کے مصر کو چھوڑنے کے بعد وہ کوہِ سینا چلے آئے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے انسانوں سے متعلق قوانین وضوابط سیکھے۔ بائبل کے مطابق 'تیسرے دن صبح کے وقت بہت زور کے بادل گرجے اور بجلی چمکی اور پہاڑ پر گہرے بادل چھا گئے' اس کے بعد کوہِ سینا دُھوئیں کے بادلوں سے ڈھک گیا اور پھر پہاڑ زور زور سے کانپنے لگا۔ بائبل کے تذکرے سے کوہِ سینا کی صحیح جگہ کا پتہ لگانا مشکل ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ ایک آتش فشاں والا پہاڑ ہو اور قدیم اسرائیلیوں کے مطابق کوئی عظیم طاقت اس پہاڑ میں ضرور بسیرا کرتی ہوگی۔ ایسا نہیں ہے کہ آتش فشاؤں سے جڑے دیوی دیوتا ہمیشہ رحم دل یا مہربان قسم کے ہوں۔ ان میں سے کئی نہایت شیطان صفت، خطرناک اور خوفزدہ کرنے والے بھی تھے۔

سب سے اونچا اور انتہائی متحرک آتش فشاں جس کے بارے میں یونانیوں کو علم تھا اُس کا نام ماؤنٹ ایٹنا تھا۔ وہ سسلی کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ وہ ماؤنٹ ڈ لکانو سے صرف پینتالیس (45) میل جنوب میں واقع تھا اور وہ قریب قریب دو میل اونچا تھا۔ قدیم یونانیوں کے زمانے سے ماؤنٹ ایٹنا تقریباً ایک سو چالیس (140) بار پھوٹ چکا ہے۔ آخری بار وہ 1971ء میں پھوٹا تھا۔

زمانہ قدیم میں کچھ لوگوں نے بتایا کہ ماؤنٹ ایٹنا پر بدی کی قوتوں اور زیوس اور دیگر خداؤں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی تھی۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت سی کہانیاں لکھیں۔ اس میں ایک شیطان صفت کا نام انسیلیوڈس تھا۔ وہ دشمنوں میں سب سے بڑا اور وحشی تھا۔ دیوی اتھینا نے اس پر ایک بڑا پتھر پھینک کر اس کو شکست دی تھی۔ وہ اس پتھر کے نیچے دَب گیا تھا۔ اسی وجہ سے سسلی کا جزیرہ بھی چپٹا ہو گیا تھا۔ انسیلیوڈس اس بھاری پتھر کے بوجھ کے نیچے ہمیشہ ہی دبا رہا۔ جس جگہ پر آج انسیلیوڈس قید ہے وہ ماؤنٹ ایٹنا کے نیچے ہے۔ کیونکہ وہ امر تھا اس لیے

وہ زندہ رہا اور جب وہ کراہتا ہے تو پہاڑ کانپتا ہے اور جب وہ بھاگنے کی تیاری میں اِدھر اُدھر کروٹ لیتا ہے تو پہاڑ کی چوٹی سے لاوا نکلنے لگتا ہے اور زلزلوں سے زمین تھرتھرانے لگتی ہے۔

یونان میں سائنسی سوچ رکھنے والے دانشوروں کو آتش فشاؤں کے نیچے دیوی دیوتاؤں یا شیطان صفتوں کے ہونے کی بات بے تکی لگی۔ وہ اِن کے پیچھے چھپی وجوہات کو تلاش کرنے لگے۔عظیم فلسفی ارسطو (428-347 قبل مسیح) کو لگا کہ زمین کی پرت کے نیچے کہیں ہوا کے خطے قید ہیں۔ وہ بہت گرم ہیں اور ہمیشہ گہرائی سے باہری سطح پر آنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔کبھی کبھی یہ ہوا ایک تہ خانے سے دوسرے تہ خانے میں چلی جاتی ہے۔اس سے سرسراہٹ پیدا ہوتی اور زلزلے آتے ہیں۔ان کی گرمی سے ہی لاوا پیدا ہوتا ہے جو پہاڑ سے نیچے کی جانب بہتا ہے۔

ایک یونانی جغرافیہ دان سٹرابو(63 قبل مسیح-19 بعد از مسیح) نے ارسطو سے اس سلسلے میں اتفاق کیا تھا۔انھیں بھی آتش فشاں ایک 'سیفٹی والو' جیسے لگے جس سے اندر کی حرارت باہر نکل سکے اور اس سے زمین کے اندر کی ہوا پُرسکون ہو سکے۔ایسا ممکن ہے کہ باہر نکلنے کا موقع نہ ملنے سے تیز ہوا کہیں زمین کو ڈانواں ڈول نہ کر دے۔زمین کے نیچے بڑی مقدار میں گرم ہوا کے ہونے پر کچھ شک ہو سکتا ہے مگر زمین کے نیچے تھوڑی مقدار میں حرارت اور گرمی ضرور ہے' اس کے بارے میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔اگر ایسا نہ ہوتا تو آتش فشاؤں کی تفصیلات پیش کرنا اور انھیں سمجھنا ناممکن ہوتا۔سچ تو یہ ہے کہ آتش فشاؤں کو دیکھ کر ہی لوگوں کو لگتا ہے کہ زمین کی سطح کے نیچے کوئی بہت گرم علاقہ موجود ہے۔کچھ لوگ یہ بھی ماننے لگے ہیں کہ زمین کی سطح کے نیچے آگ کا ایک علاقہ ہے اور خدا کے سبھی نافرمانوں اور باغیوں کو وہاں سزا ملتی ہے۔

قدیم زمانے کے یونانیوں کا خیال تھا کہ مردہ انسانوں کی روحیں ہیڈیز نام کی دھندلی سلطنتوں میں رہتی ہیں' جو مغرب کی جانب بحر اوقیانوس میں واقع مانا جاتا تھا۔ یہاں یہ روحیں غریبی میں اپنا جیون گزارتی ہیں مگر انھیں کوئی سزا نہیں بھگتنا پڑتی۔یونانیوں کا خیال تھا کہ زمین کی بہت گہرائی میں ایک اور جگہ جس کا نام ٹارٹرس ہے۔وہاں گنہگاروں کو اُن کی غلطیوں کے باعث مسلسل مختلف طریقوں سے سزائیں دی جاتی ہیں۔

قدیم زمانے کے اسرائیلیوں کا خیال تھا کہ مردہ روحیں زمین کے اندر شیئول میں رہتی ہیں۔شیئول بالکل یونانیوں کے ہیڈیز جیسا تصور تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہودی دانشور یونانی تصورات سے متاثر ہوئے اور پھر شیئول آہستہ آہستہ ٹارٹرس میں بدل گیا۔آج اسے ہم دوزخ یا 'ہیل' کے نام سے بلاتے ہیں۔

جب عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل آئی تب دوزخ کا تصور ایک بڑے آتش فشاں کے اندرونی حصے کا سا تھا۔آتش فشاؤں میں سے لاوے کی دھاریں نکلتی ہیں' جو گرمی سے دہکتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان میں آگ لگی ہو۔آتش فشاؤں سے گیس کے بادل نکلتے ہیں جو زمین کی بہت گہرائی میں پائے جانے والے مادوں کے بنے ہوتے ہیں۔اس کے ساتھ کافی مقدار میں بھاپ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی نکلتی ہے۔ چونکہ

ان کی کوئی خاص بُو نہیں ہوتی، اس لیے لوگ انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ زمین کی تہ میں گندھک ہوتی ہے اور یہ گندھک آکسیجن سے مل کر سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس بناتی ہے۔ جس کی بُو سے لوگوں کو گھٹن محسوس ہوتی ہے۔

سلفر کا ایک پرانا نام 'برمسٹون' ہے' اس لیے سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس کی بدبو کو کبھی کبھی 'برمسٹون کی بدبو' بھی کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے برمسٹون کا تعلق آتش فشاؤں کے ساتھ بھی جوڑا جاتا ہے۔ اسی لیے بائبل میں سوڈوم اور گومورا جیسے شیطان صفت شہروں کی تباہی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے'اور پھر خدا نے سوڈوم اور گومورا پر برمسٹون اور آگ کی بارش کی'۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوڈوم اور گومورا کسی آتش فشاں کے پھٹنے سے تباہ ہوئے ہوں اور اس واقعے کو لوگوں نے بائبل کی کہانی میں پرو دیا ہو۔ چونکہ دوزخ کی منظر کشی کسی آتش فشاں کے اندر کی گئی ہے اس لیے دوزخ میں 'برمسٹون اور آگ' کا ہونا تصور کیا گیا۔ اس لیے جب پادری لگاتار گناہ کرنے والوں کو دوزخ بھیجنے کی دھمکی دیتے ہیں تو وہ دراصل انھیں 'برمسٹون اور آگ' کا پیغام دیتے ہیں۔

3: آتش فشاؤں کے بڑے دھماکے

زمانۂ قدیم میں یونانی اور رومی آتش فشاؤں کے خطروں سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔ انھیں بس اتنا پتہ تھا کہ ماؤنٹ ایٹنا اور ماؤنٹ ؤلکانو میں سے ہمیشہ دھواں اور چنگاریاں نکلتی رہتی تھیں، لہٰذا ان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ انھیں یہ علم نہیں تھا کہ عام سے دکھائی دینے والے پہاڑوں میں اچانک دھماکہ ہو سکتا ہے اور اس سے پلک جھپکتے میں پورے کے پورے شہر تباہ ہو سکتے ہیں۔ ویسے تھیرا کی مثال اُن کے سامنے تھی۔ البتہ وہ پرانی بات اب اٹلانٹس کی کہانی میں بدل چکی ہے اور لوگ اُس کے بارے میں لگ بھگ بھول ہی چکے ہیں۔ ویسے بھی اُس کہانی میں صرف زلزلوں کا ذکر ہے، آتش فشاؤں کا نہیں۔ مگر رومی سلطنت کے ابتدائی سالوں میں آتش فشاؤں کے پھٹنے کی دل دہلا دینے والی مثال سامنے آئی۔

جنوبی اٹلی کا ایک بڑا شہر نیپلز ہے۔ جس سے پندرہ میل دور وسوویس کا پہاڑ واقع ہے۔ وہ قریب قریب ایک میل اونچا ہے اور زمانۂ قدیم کے روم میں لوگ اسے ایک عام سا پہاڑ کہتے تھے۔ رومیوں کے پاس ایسی کوئی دستاویز نہیں تھی جس میں وسوویس سے دُھواں اور راکھ نکلنے کا کوئی ذکر ہو۔ پہاڑ کے آس پاس کی زمین کافی زرخیز تھی اور وہاں لاتعداد کھیت تھے۔ پہاڑ کی جنوبی ڈھلان پر دو شہر آباد تھے: پومپی اور ہرکیولینیئم۔ پومپی کی بنیاد کوئی پانچ سو (500) قبل مسیح میں رکھی گئی تھی اور اس کے سو سال بعد تک وہ خوب پھلتا پھولتا رہا۔ رومی سلطنت کے ابتدائی سالوں میں کئی صاحب حیثیت رومیوں کے ہاں بڑے بڑے گھر تھے۔ کبھی کبھار وسوویس کے آس پاس زلزلے کے جھٹکے بھی آتے تھے مگر ایسے واقعات بحر روم کے علاقے میں اکثر و بیشتر پیش آتے رہتے تھے۔ ایسا ایک وقوعہ تریسٹھ (63) قبل مسیح میں نیرو حکمران کے عہد میں پیش آیا تھا۔ اس سے روم کے شہروں کو کافی نقصان پہنچا تھا مگر لوگوں نے مکانوں کی پھر سے مرمت کی اور زندگی رواں دواں ہوگئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اُناسی (79) عیسوی میں کئی چھوٹے چھوٹے زلزلے آئے اور پھر چوبیس (24) اگست کو وسوویس پھٹا۔

راکھ، دھوئیں، بھاپ اور سانس روکتی گیس کے بادلوں نے پورے پہاڑ کو ڈھانک لیا۔ پھر پہاڑ سے لاوے کی ندیاں پومپی اور ہرکیولینیئم کی جانب بہنے لگیں۔ شہریوں کو آتش فشاؤں کے خطرات کی کچھ سوجھ بوجھ نہیں تھی اس لیے دھماکے کے آغاز میں وہ شہر میں ہی رہے مگر جب انھوں نے شہر سے نقل مکانی کرنے کا سوچا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس حادثے میں لگ بھگ بیس ہزار لوگ مارے گئے۔

مرنے والوں میں روم کے معروف ادیب پلائینی (23-79 ق م) بھی تھے۔ وہ قریب کی گھاٹی میں ایک جہاز پر تھے۔ ماؤنٹ وسوویس سے دھواں نکلتے دیکھ کر پلائینی اس کا قریب سے جائزہ لینے کے لیے سمندر کنارے کھڑا ہو گیا۔ وہاں دھوئیں کے بادلوں سے اُس کی موت ہو گئی۔ اس کا ذکر پلائینی کے بھتیجے پلائینی دی ینگر (62-113 ق م) نے اپنی ایک رپورٹ میں کیا ہے۔ اس کے بعد سے وسوویس میں کبھی کوئی بستی آباد نہیں ہوئی۔ کئی صدیوں تک وسوویس ایک دم پُرسکون رہا اور پھر اس میں سے لاوا پھوٹنا شروع ہو گیا۔ 1631ء میں اس میں ایک بڑا دھماکہ ہوا۔ یہ شاید اُناسی (79) عیسوی کے بعد سب سے خطرناک دھماکہ تھا۔ اس میں قریب چار ہزار لوگوں کی موت ہوئی۔ اس کے بعد سے وہ دس سال سے زیادہ کبھی بھی پُرسکون نہیں رہا ہے۔

1709ء میں لوگوں نے مٹی اور راکھ کے ملبے کو پومپی کی بنیادوں کی تلاش کرنے کے لیے کھودا۔ (ہرکیولینیئم لاوے کی کافی گہرائی میں دبا ہوا ہے اور اُسے کھودنا آسان نہیں ہے)۔ پومپی میں جو آثار ملے اُن سے لوگ ابتدائی رومی سلطنت میں لوگوں کی زندگی کے متعلق کافی کچھ جان پائے۔ اس قسم کی معلومات اور کسی طریقے سے کبھی حاصل نہیں ہو پائیں۔ پومپی کے کھنڈرات دھیرے دھیرے سیاحوں کے لیے دلچسپی کا مرکز بن گئے۔ 1979ء میں وسوویس کے پھٹنے کے انیس سو سال بعد نیویارک میں اس کی باقیات اور آثار کی نمائش لگائی گئی۔

براعظم یورپ میں ماؤنٹ وسوویس ہی ایک متحرک آتش فشاں ہے مگر ماؤنٹ ایٹنا اس سے بڑا ہے اور کہیں زیادہ خطرناک بھی۔ ماؤنٹ ایٹنا اکثر پھٹتا رہتا ہے۔ 1669ء میں اس میں ایک خطرناک دھماکہ ہوا تھا جس میں چودہ (14) شہر جل کر راکھ ہوئے تھے اور قریب قریب بیس ہزار لوگوں کی موت ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں کے مطابق اگر ماؤنٹ ایٹنا آتش فشاں میں مرے سبھی لوگوں کا ریکارڈ اکٹھا کیا جائے تو اُن کی تعداد دس لاکھ سے بھی زیادہ ہوگی۔ اب ماؤنٹ ایٹنا کی ایک آتش فشاں کے روپ میں اچھی پہچان بن چکی ہے۔ لوگوں کو پتہ ہے کہ وہ نقصان پہنچا سکتا ہے، اس لیے وہ اس سے دور رہتے ہیں۔ دوسری جانب وسوویس کے دھماکے سے سبھی لوگ حیران رہ گئے۔ اس حیران کن ڈرامے اور پومپی اور ہرکیولینیئم شہروں کے پوری طرح تباہ ہو جانے کے باعث ہی وسوویس کے دھماکے کو زمانۂ قدیم کے سب سے مشہور آتش فشاں سے جڑا واقعہ مانا جاتا ہے۔ صدیاں گزرنے کے بعد یورپ کے محققین نے دنیا کے بارے میں بہت کچھ تلاش کیا اور معلومات حاصل کی ہیں۔ انھیں یہ بھی پتہ چلا کہ اُن کے اپنے براعظم میں بھی کئی خطرناک آتش فشاں موجود ہیں۔

آئس لینڈ کی ہی مثال کو دیکھیں۔ وہ سکاٹ لینڈ سے پانچ سو میل دور شمال مغرب میں واقع ہے اور اس کا حدود اربع ریاست کینٹکی سے وسیع ہے۔

وہ شمال میں آباد ایک ٹھنڈی جگہ ہے اوراس کا بیشتر حصہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔اس کے باوجودوہاں آتش فشاؤں کی کمی نہیں ہے۔ایسا لگتا ہے کہ وہاں زمین کے نیچے بہت حرارت موجود ہے۔آئس لینڈ میں ایک آتش فشاں کا نام لاہکی ہے۔1783ء میں وہ پھٹنا شروع ہوا اور دوسال تک اس کے کریٹر میں سے لاوا نکلتا رہا' کبھی تیزی سے اور کبھی دھیرے سے۔آہستہ آہستہ یہ لاوا 220 مربع میل کے علاقے میں پھیل گیا۔ لاوے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوا کیونکہ اس علاقے میں بہت کم لوگ رہتے تھے البتہ اس سے لاہکی کی ہواؤں میں لگا تار سلفر ڈائی آکسائیڈ اور راکھ اُڑتی رہی۔یہ راکھ پورے براعظم میں پھیلی اور کچھ تو سکاٹ لینڈ تک آن پہنچی۔ ہوا میں راکھ کے ہونے سے آسمان کالا ہو گیا۔فصلیں دھوپ نہ ملنے سے تباہ ہو گئیں۔سلفرڈائی آکسائیڈ کے باعث جزیرے کے تین چوتھائی گھریلو جانور مر گئے۔فصلوں اور جانوروں کے خاتمے کے بعد آئس لینڈ کے اس جزیرے کی بیس فی صد آبادی یعنی قریب دس ہزار لوگ فاقوں اور بیماریوں سے مارے گئے۔

آئس لینڈ کا آتش فشاں

آتش فشاؤں کے اس سے بھی بُرے حادثات انڈونیشیا میں واقع ہوئے ہیں۔یہ جزائر کا ایک گروپ ہے جو جنوب مشرقی ایشیا میں واقع ہے۔ سومباوا کا چھوٹا جزیرہ، جاوا کی طرح کے بڑے جزیرے کے مشرق میں واقع ہے۔سومباوا میں ایک پہاڑ ہے ماؤنٹ ٹمبورا۔یہ تیرہ ہزار فٹ اونچا آتش فشاں، 7 اپریل 1815ء کو پھٹا۔زمین پر تھیرا کے بعد اسے سب سے بھیانک آتش فشاں کا دھماکہ مانا جاتا ہے۔پہاڑ کے اوپر کا چار ہزار فٹ اونچا حصہ ہوا میں روئی کی طرح اُڑ گیا۔اس سے چھتیس مربع میل ملبہ (پتھر اور دھول) فضا میں بکھرا۔پتھروں اور دھول کی بارش سے تقریباً بارہ ہزار لوگوں کی موت ہوئی۔جانوروں اور فصلوں کے تباہ ہونے سے سومباوا اور مغرب میں بسے لوبوک جزیرے پر لگ بھگ اسی ہزار لوگ قحط کا شکار ہوئے۔

فضا میں بکھرے پتھر اور دُھول کے ذرات کئی میل کی اونچائی تک گئے۔یہ ہوا کے اوپری حصے میں کئی مہینوں تک تیرتے رہے۔وہاں پر دُھول کے ذرات سورج کی روشنی کو منعکس کرتے رہے جس سے زمین پر بہت کم دھوپ پہنچ پائی۔اس وجہ سے تقریباً ایک سال تک نیچے زمین کا درجۂ حرارت معمول سے کم رہا۔مثال کے طور پر 1816ء میں نیو انگلینڈ میں بہت زیادہ سردی پڑی اور جولائی اور اگست میں لہو جما دینے ٹھنڈ پڑی اور اس سال گرمی کا موسم ہی غائب ہو گیا۔اس وقت نیو انگلینڈ کے لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ اُن کی مصیبت کی وجہ زمین کے دوسرے کنارے پر ایک آتش فشاں کا پھٹنا ہے۔اڑسٹھ سال بعد اس سے بھی بھیانک دھماکہ کریکٹووا جزیرے میں ہوا۔یہ جزیرہ مین ہیٹن کے برابر کا ہے اور جاوا اور سماٹرا کے وسط میں واقع ہے۔

تھیرا کی طرح یہ پورا جزیرہ ہی ایک آتش فشاں ہے۔البتہ ماؤنٹ کریکٹووا دیکھنے میں بہت خطرناک نہیں تھا۔1680ء میں اس میں ایک چھوٹا دھماکہ ضرور ہوا تھا مگر اس کے بعد دوسو سال تک وہ پُرسکون رہا۔پھر 27۔اگست 1883ء کو صبح دس بجے تک پہاڑ کے اندر دھیرے دھیرے حرارت اور دباؤ اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ پہاڑ کا ٹھوس لاوا بھی اس پر قابو پانے میں ناکام رہا اور پھر ماؤنٹ کریکٹووا میں ایک بھیانک دھماکہ ہوا۔

دھماکے میں ماؤنٹ ٹیمبورا جتنے پتھر اور دھول تو نہیں نکلی مگر جو نکلا وہ یک دم زور کے ساتھ نکلا۔ اس دھماکے کی آواز کانوں کو بہرہ کر دینے والی تھی۔ دھماکے کی آواز تمام اطراف میں ہزاروں میل دور تک سنائی دی۔ اگر کریکٹوا کا دھماکہ کینساس میں ہوا ہوتا تو تمام امریکی عوام اس کی گونج کوسُن پاتے۔ اور ساتھ ساتھ کینیڈا اور میکسیکو میں بہت سے لوگ بھی اس کی آواز کوسن پاتے۔ آتش فشاں سے نکلے پتھر اور دھول 3 لاکھ مربع میل کے علاقے میں پھیل گئے۔ یہ ٹیکساس کے علاقے پھل سے زیادہ بڑا علاقہ بنتا ہے۔ دھماکے سے اس جزیرے کے چاروں اطراف سمندر کے پانی میں کپکپاہٹ پیدا ہوئی جس سے سونامی پیدا ہوئی اور جاوا اور سماٹرا کے ساحلوں پر ایک سو بیس (120) فٹ اونچی لہروں نے تباہی مچائی۔ اس حادثے میں 163 گنا زیادہ تباہی ہوئی اور لگ بھگ چالیس ہزار لوگوں کی جانیں گئیں۔ اس دھماکے میں ماحول کی اوپری سطح پر ٹیمبورا کی راکھ کے بادلوں جتنی راکھ تو نہ پھیلی اور زمین بھی اتنی ٹھنڈی نہیں ہوئی مگر ہوا میں راکھ کو زمین پر آتے آتے تین سال کا وقت لگا۔ ان تین سالوں میں ہوا میں راکھ کی موجودگی کے باعث پوری دنیا میں سورج سرخ رنگ کی روشنی کے ساتھ بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔

جدید دور میں جنوبی کرۂ ارض میں آتش فشاں کا سب سے بھیانک دھماکہ کیری بیئن سمندر میں واقع مارٹنیک جزیرے میں ہوا۔ اس جزیرے کے شمال مغرب میں ماؤنٹ پیلی نام کا ایک آتش فشاں پہاڑ ہے۔ ماضی میں اس پہاڑ نے کچھ خاص نقصان نہیں پہنچایا تھا مگر پھر اچانک اپریل 1902ء میں اس میں سے دھواں، راکھ اور گیسیں نکلنا شروع ہوئیں۔ چونکہ حالات میں کوئی بہت زیادہ خرابی نہیں تھی اس لیے لوگوں نے سینٹ پیرے سے نقل مکانی نہ کی۔

سینٹ پیرے اس جزیرے کا دارالحکومت تھا اور ماؤنٹ پیلی کی وادی میں آباد تھا۔ لوگوں کو لگا کہ اگر ماؤنٹ پیلی سے لاوا نکلے گا بھی تو پہاڑ کے سائز کے باعث وہ سینٹ پیرے کی جانب نہیں بہے گا۔ اس وجہ سے آس پاس کے گاؤں کے لوگ اپنی حفاظت کے لیے سینٹ پیرے میں آ گئے مگر 7 مئی کو ایک اور دھماکہ ہوا۔ ماؤنٹ پیلی میں نہیں بلکہ ماؤنٹ سوفریر میں۔ یہ آتش فشاں ایک جزیرے سینٹ ونسینٹ پر واقع تھا جو مارٹنیک جزیرے سے سو میل جنوب کی جانب تھا۔ ماؤنٹ سوفریر کے دھماکے میں قریب دو ہزار لوگوں کی موت ہوئی۔

اب مارٹنیک جزیرے کے لوگوں نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔ انھیں لگا کہ جو دباؤ ماؤنٹ پیلی کو پریشان کر رہا تھا وہ ماؤنٹ سوفریر کے پھٹنے سے کم ہوا ہوگا۔ انھیں لگا کہ جلد ہی ماؤنٹ پیلی پر مکمل سکون ہو جائیگا اور پھر دیگر لوگ بھی سینٹ پیرے میں آرام سے جی سکیں گے۔ مگر ماؤنٹ پیلی نے سب کو دھوکا دیا۔

8 مئی 1902ء کو صبح سات بج کر پچاس منٹ پر ماؤنٹ سوفریر کے پھٹنے سے چوبیس گھنٹوں کے اندر ماؤنٹ پیلی میں بھی دھماکہ ہوا۔ لاوے کی ایک دھار پہاڑ کی ڈھال سے نیچے بہنے لگی۔ سینٹ پیرے کے لوگ اس لاوے سے بچ گئے مگر اس دھماکے نے لال گرم گیسوں اور دھوئیں کا ایک گہرا بادل بھی پیدا کیا۔ یہ تمام گیسیں پہاڑ کی ڈھلوان سے اُتر کر سیدھی سینٹ پیرے پہنچیں۔

تباہی کے بعد کا منظر

تین منٹوں میں اڑتیس ہزار لوگوں کی گرم اور زہریلی گیس سے موت واقع ہوگئی۔ پورے شہر میں ایک قیدی کے علاوہ کوئی بھی زندہ نہیں بچ پایا۔ یہ قیدی ایک تہ خانے میں بند تھا اور وہ بال بال بچا۔ اگلے دن اُسے پھانسی پر چڑھایا جانا تھا مگر وہ اکیلا ہی زندہ بچ گیا اور باقی سارے شہری مارے گئے۔

جہاں تک امریکہ کی بات ہے وہاں ہوائی اور الاسکا کے علاقوں میں آتش فشاں ہیں۔ ہوائی جزیرے کا علاقہ پھل لگ بھگ کنیکٹیکٹ جتنا بڑا ہے۔ ہوائی جزیرہ اصل میں ایک بڑا پہاڑ ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ، مگر اونچائی میں نہیں۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی مونالووا تقریباً ڈھائی میل اونچی ہے۔ یہ دنیا کا سب سے اونچا متحرک آتش فشاں ہے۔ مونالووا کی مشرقی ڈھلان پر ایک کریٹر ہے جس کا نام کیلویا ہے۔ وہ دو میل چوڑا ہے اور دنیا کا سب سے بڑا اور متحرک آتش فشاں ہے۔ وہ کم و بیش ہمیشہ متحرک رہتا ہے اور کبھی کبھی اس میں سے لاوا بھی نکلتا ہے مگر وہاں آج تک کبھی دھماکہ نہیں ہوا ہے۔

جدید دور میں امریکہ میں آتش فشاں کا سب سے بڑا دھماکہ جون 1912ء میں ماؤنٹ کاٹمائی 'الاسکا' میں ہوا تھا۔ آتش فشاں کے آس پاس 5000 مربع میل کا علاقہ راکھ اور دھول سے اَٹ گیا تھا۔ کچھ دھول اور راکھ تو ایک سو (100) میل دور واقع کوڈیک شہر تک جا پہنچی تھی۔ اس شہر کو خالی کرالیا گیا مگر اُس وقت الاسکا کی آبادی اتنی کم تھی کہ جان و مال کا بہت کم نقصان ہوا۔

امریکہ کی پچاس (50) ریاستوں میں ہوائی اور الاسکا کو چھوڑ کر اور کہیں بھی آتش فشاں نہیں ہیں۔ کچھ متحرک آتش فشاں کاسکیڈ کے پہاڑی سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سلسلے اوریگان سے واشنگٹن تک شمال سے جنوب کی جانب جاتے ہیں۔ کاسکیڈ پہاڑی سلسلے کی پندرہ چوٹیوں پر آتش فشاں موجود ہیں مگر حالیہ سالوں میں وہ بہت زیادہ فعال نہیں رہے ہیں۔

کاسکیڈ رینج کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ رینیئر ہے جو واشنگٹن کے تاکوما شہر سے پچاس (50) میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ پہاڑ پونے تین میل اونچا ہے۔ ویسے تو یہ آتش فشاؤں کا ایک سلسلہ ہے مگر پچھلے دو ہزار سالوں میں اس میں کوئی دھماکہ نہیں ہوا مگر ماؤنٹ رینیئر سے سو میل کی دوری پر ماؤنٹ ہوڈ ہے جو دو میل سے کچھ زیادہ اونچا ہے۔ اوریگان ریاست میں یہ سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ یہ بھی ایک آتش فشاں ہے البتہ ایک لمبے عرصے سے ٹھنڈا پڑا ہے۔ 1975ء میں کاسکیڈ رینج کی چوٹیوں میں پچھلے ساٹھ سالوں سے کوئی آتش فشاں فعال نہیں دکھائی دیا۔

ماؤنٹ رینیئر کے شمال میں ایک سو پینتیس (135) میل کی دوری پر ماؤنٹ بیکر واقع ہے۔ وہ کینیڈین سرحد کے قریب ہے اور دو میل اونچا ہے۔ مارچ 1975ء میں ماؤنٹ بیکر کی چوٹی سے سفید دھواں نکلنا شروع ہوا۔ اُسے دیکھ کر لوگوں کو پہلے تو ایسا لگا جیسے جنگل میں آگ لگی ہو مگر بعد میں جب اُس میں سے راکھ اور گیسیں نکلیں تو لوگوں کو آتش فشاں

کے متحرک ہونے کا علم ہوا۔اس کے بعد ماؤنٹ بیکر میں کچھ خاص نہیں ہوا البتہ اسی قسم کا تحرک ماؤنٹ سین ہیلنز میں دیکھا گیا۔ ماؤنٹ سین ہیلنز واشنگٹن کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور وہ پورٹ لینڈ ،اوریگن سے کوئی پینتالیس میل دور ہے۔

دو میل اونچے ماؤنٹ سین ہیلنز 1831ء سے لے کر 1854ء تک کافی متحرک دکھائی دیا۔اس وقت اس علاقے میں بہت زیادہ لوگ نہیں رہتے تھے،اس لیے وہاں کیا ہوا؟ اس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت یا عینی شہادت نہیں ہے مگر اس علاقے میں کوئی خاص نقصان بھی نہیں ہوا۔اس کے بعد ماؤنٹ سین ہیلنز ایک سو پچیس (125) سالوں تک پُرسکون رہا۔ وہ برف سے ڈھکا ایک خوبصورت پہاڑ ہے اور کوئی بھی اُسے خطرناک نہیں سمجھتا تھا مگر 1980ء میں ماؤنٹ سین ہیلنز کے آس پاس کے مرکز میں زلزلے آنے لگے۔ پہلے تو وہاں کئی ہلکے زلزلے آئے مگر پھر ستائیس مارچ کو پہاڑ کی چوٹی سے کچھ بھاپ اور راکھ نکلی۔

چھ ہفتوں تک کچھ خاص نہیں ہوا اور ایسا لگا کہ یہ تحریک بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔ جیسا کہ 1975ء میں ماؤنٹ بیکر میں ہوا تھا مگر 18 مئی 1980ء کو صبح کے وقت دو ہلکے زلزلے آئے اور بعد میں ماؤنٹ سین ہیلنز میں دھماکہ ہوا۔ دھماکہ کرکاٹوا جیسا بھیانک تو نہیں تھا مگر پھر بھی وہ امریکی تاریخ میں اس کی پچاس ریاستوں میں ہونے والا سب سے بڑا دھماکہ تھا۔ لاکھوں کروڑوں ٹن راکھ اور پتھر ہوا میں بارہ میل اونچائی تک اُڑے۔ آہستہ آہستہ یہ راکھ آتش فشاں سے پانچ سو (500) میل دور مشرق تک پھیل گئی۔ کہیں کہیں تین چار فٹ موٹی راکھ اور دھول کی پرت بن گئی۔ ماؤنٹ سین ہیلنز کی برف پگھل کر مٹی اور راکھ کے ساتھ مل گئی اور اس سے حیران کُن گارے کا آمیزہ بن گیا۔جس میں تمام گھر، کاریں اور پُل بہہ گئے۔خوش قسمتی سے ہلکے زلزلے کے جھٹکوں کے بعد وہاں کے سبھی رہائشی پلاین چلے گئے تھے۔اس کے باوجود بیس لوگ مرگئے اور سو (100) کا کوئی پتا نہ چل پایا کہ کہاں گئے۔غور طلب بات یہ ہے کہ ماؤنٹ سین ہیلنز ابھی بھی متحرک ہے اور اس میں اب بھی دھماکے ہوتے رہتے ہیں اور اس کی یہ رفتار سالوں تک جاری رہ سکتی ہے۔

بعض اوقات ایسی جگہوں پر بھی آتش فشاں پھٹ سکتے ہیں جہاں کوئی پہاڑ نہ ہو۔ ریاست میکسیکو کے شہر میکسیکو سے مغرب میں دو سو (200) میل دوری پر ایک گاؤں پاری کیوٹین ہے۔بیس فروری 1943ء کو گاؤں سے تین میل دوری پر کسانوں کی ٹولی مکئی کے کھیت میں کام کر رہی تھی۔ شام کو چار بجے انھیں زمین میں ایک دراڑ دکھائی دی۔آہستہ آہستہ دراڑ بڑھتی گئی۔ کسانوں کے پیروں کے نیچے کی زمین کانپنے لگی۔ پھر اس دراڑ میں سے دھواں اور لپٹیں نکلنے لگیں۔

کسان وہاں سے بھاگ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ اگلی صبح تک جہاں پہلے مکئی کا کھیت تھا، وہاں اب سو (100) فٹ اونچا راکھ کا ڈھیر تھا۔ آہستہ آہستہ یہ چھوٹا ٹیلہ بڑھتا گیا اور زیادہ اونچا ہوتا گیا۔ یہ ایک آتش فشاں تھا جو پھٹ رہا تھا اور بڑھ رہا تھا۔اس آتش فشاں کا نام ماؤنٹ پاریکیوٹن پڑا۔ ایک سال کے اندر ہی اس آتش فشاں کی اونچائی پندرہ سو (1500) فٹ ہو گئی تھی اور وہ پورے پاریکیوٹن گاؤں کو نگل گیا۔ پومپی کی طرح پاریکیوٹن گاؤں بھی آتش فشاں کی زد میں آ گیا مگر یہاں یہ

پھیلا و دھیمی رفتار سے ہوا اور اس میں کوئی جان نہیں تھی ۔ دو سال کے اندر ماؤنٹ پاریکیوٹن نے ایک اور بڑے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس گاؤں کے لوگوں نے بھی بغیر کسی نقصان کے وہاں سے پلا ین نقل مکانی کی ۔ ابتدا سے لے کر 1952ء تک آتش فشاں پھوٹنا بند ہو گیا۔ تب تک ماؤنٹ پاریکیوٹن ایک چوتھائی میل سے زیادہ اونچا ہو چکا تھا اور آس پاس سبھی اطراف میں سات میل تک سبزہ ختم ہو گیا تھا۔

پاریکیوٹن تباہی کے بعد

4۔ ہمارے پیروں کے نیچے کی حرارت

آتش فشاؤں کے بارے میں ہمیں ایک طویل تجربہ ہے، البتہ آتش فشاں کیسے پیدا ہوتے ہیں، اس بارے میں کیا ہم جانتے ہیں؟ جی ہاں، ایک قدیم نظریے کے مطابق زمین کے نیچے بہت حرارت پائی جاتی ہے۔ آتش فشاؤں کو سمجھنے کا ابھی تک یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ ہم زمانہ قدیم سے ایک بات جانتے ہیں کہ زمین کے نیچے بہت گرمی ہے اور اسے ہم آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔

دنیا میں الگ الگ جگہوں پر لوگ سونا، ہیرے اور دیگر قیمتی دھاتیں نکالنے کے لیے کھدائی کرتے ہیں۔ کھدائی جتنی زیادہ گہری ہوتی ہے، وہاں اتنا ہی زیادہ درجۂ حرارت ہوتا ہے۔ یہ صورتحال، خواہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، ہر ایک کھدائی کے بارے میں سچ ہے۔ دنیا کی سب سے گہری کھدائی جنوبی افریقہ میں ہوئی۔ یہ کھدائی دو میل گہری ہے اور اس گہرائی پر وہاں کے پتھروں کا درجہ حرارت °126 ڈگری فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔

جب تک اوپر سے ٹھنڈی ہوا نیچے نہ پھینکی جائے تب تک وہاں لوگوں کے لیے کام کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

سائنس دان یہ بھی مانتے ہیں کہ گہرائی کے ساتھ ساتھ زمین کی گرمی بڑھتی جاتی ہے۔ زمین کی سطح سے ایک سو (100) میل کی گہرائی پر وہاں کے پتھروں کا درجہ حرارت °2000 ڈگری فارن ہائیٹ ہوگا۔ زمین کی سطح پر اتنے زیادہ درجہ حرارت پر پتھر پگھل کر لاوا بن جاتے ہیں۔ البتہ اتنی گہرائی میں اوپر کے پتھروں کے شدید دباؤ کے باعث نیچے کے پتھر ایک دم دبے رہتے ہیں۔ وہ ٹھوس رہتے ہیں اور پگھلتے نہیں ہیں۔

زمین کی پپڑی (کرسٹ) کے نیچے گرم اور لال پتھروں کی پرت کو 'مینٹل' کہا جاتا ہے۔ اس مینٹل کے نیچے زمین کور کہلاتی ہے۔ اس کور میں زیادہ تر لوہا ہوتا ہے اور وہ اتنا گرم ہوتا ہے کہ وہ ایک سفید مائع جیسا دکھائی دیتا ہے۔ زمین کے مرکز میں درجہ حرارت °5000 سے °6000 ڈگری فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔ دراصل یہ درجہ حرارت سورج کی سطح کے درجہ حرارت جتنا ہوتا ہے۔ زمین کے اندر بہت زیادہ حرارت پائی جاتی ہے جس سے آتش فشاؤں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ساری حرارت وہاں آئی کیسے؟ اس کا جواب زمین کیسے پیدا ہوئی میں مل سکتا ہے۔

آج سے چند دہائیاں پہلے اکثر ماہرین فلکیات کا ماننا تھا کہ زمین کسی زمانے میں سورج کا حصہ رہی ہوگی ۔ اُن کے مطابق کھربوں سال پہلے سورج کے پاس سے گزرتے کسی تارے نے کشش ثقل کے باعث سورج کا ایک حصہ اپنی جانب کھینچا ہوگا اور اسی سے زمین سمیت ہمارے

سیاروں کے دوسرے گروہ بھی بنے ہونگے۔ایسا وقوع پذیر ہونے پر زمین کے مرکز کا درجہ حرارت اور سورج کی سطح کے درجہ حرارت کا ایک جیسا ہونا سمجھ میں آتا ہے۔خوش قسمتی سے، زمین کی باہر کی سطح دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوئی اور اسی وجہ سے آج ہمارے ساتھ دیگر جاندار بھی پھل پھول رہے ہیں۔البتہ جب ماہرین فلکیات نے زیادہ غوروخوض کیا تو زمین کے کبھی سورج کا حصہ ہونے کا نظریہ غلط ثابت ہوا۔اس نظریے میں کئی تضادات ہیں اور ماہرین فلکیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری زمین کبھی بھی سورج کا حصہ نہیں رہی۔

1944ء میں ایک جرمن ماہر فلکیات کارل فریڈرک وون وائز سیکر ایک پرانے نظریے کی جانب لوٹے جسے بعض لوگوں نے غلط سمجھ رکھا تھا۔وہ اُس پرانے نظریے میں تبدیلیاں لائے اور پھر دیگر ماہرین فلکیات بھی اُسے صحیح ماننے لگ گئے۔اس تبدیل شدہ نظریے کے مطابق سورج اور اُس کے تمام سیارے ایک طاقت ور دھول اور گیس کے بادل سے ایک ہی وقت میں پیدا ہوئے تھے۔دھول اور گیس کے ذرات نے آپس میں مل کر بڑے ذرات بنائے، جن سے اور بڑے ٹکڑے بنے اور پھر ان سے بھی بڑے۔

آخر میں مادے کے بڑے ٹکڑے آپس میں ٹکرائے اور کشش ثقل کے باعث اُن کی ایک کائنات بن گئی۔مادے کے سب سے زیادہ ٹکڑے بادل کے مرکز میں تھے جن کے آپس میں ملنے سے سورج بنا جس کا سائز باقی سیاروں کو ملا کر بھی بڑا ہے۔تاہم بادل کے کناروں پر پھر بھی بہت سا مادہ باقی بچ گیا جس سے باقی سب سیارے بنے۔

اگر آپس میں ملنے والے سبھی ٹکڑے ٹھنڈے تھے تو پھر ہماری زمین اتنی گرم کیوں ہے؟

جب دو ٹکڑے کشش ثقل کے باعث آپس میں ٹکراتے ہیں تو رفتار کی طاقت سے حرارت میں بدل جاتے ہیں۔جیسے جیسے اور ٹکڑے ٹکرا کر ایک بڑا جسم بناتے ہیں، ویسے ویسے اور زیادہ حرارت پیدا ہوتی ہے۔آخر میں جب زمین جیسا بڑا جسم بنتا ہے تب تک اتنی طاقت پیدا ہو چکی ہوتی ہے جس سے وہ جسم ایک دم سفید گرم ہو جائے۔یہ بات فطری ہے کہ جتنے زیادہ ٹکڑے آپس میں ملیں گے اتنا ہی زیادہ جسم گرم ہوگا۔مشتری سیارہ، زمین کی نسبت بہت بڑا ہے اور اس کا مرکز زمین کے مقابلے میں بہت زیادہ گرم بھی ہے۔سورج جو سیاروں کے گروہ میں سب سے بڑا ہے، سب سے زیادہ گرم بھی ہے۔

اگر ہماری زمین شروع میں بہت گرم تھی تو لاکھوں کروڑوں سالوں میں اس کی باہری سطح آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوئی ہوگی مگر اس کا اندرونی حصہ کیوں ٹھنڈا نہیں ہوا؟ زمین مکمل طور پر کیوں نہیں ٹھنڈی ہو رہی؟ اس کا جواب ہے کہ پتھروں کی موٹی تہوں سے حرارت بہت دھیمی رفتار سے ہی باہر آتی ہے۔پتھر ایک قسم کا 'انسولیٹر' ہوتا ہے اور وہ حرارت کو نکلنے سے روکتا ہے۔زمین کی سطح کے ٹھنڈے پتھر ایک کمبل کی طرح نچلی تہوں کو گرم رکھنے کا کام کرتے ہیں۔زمین کی کرسٹ کے پتھروں سے حرارت نکلتی ضرور ہے مگر اس کی رفتار بہت آہستہ ہوتی ہے۔ممکن ہے لاکھوں کروڑوں برس گزرنے کے بعد ایک دن ہماری زمین بھی پوری کی پوری ٹھنڈی ہو

جائے گی۔

1900ء کے آس پاس سائنس دانوں کی اکثریت کا ماننا تھا کہ ہماری زمین کی عمر لگ بھگ بیس (20) کروڑ سال ہوگی اور اتنی کم مدت میں زمین کا پوری طرح ٹھنڈا ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ 1905ء میں ایک امریکی سائنس دان برٹریم بی بولٹوڈ (1870-1927) نے پتھروں کی عمر جاننے کی ایک تکنیک ایجاد کی جو یورینیم پر مشتمل تھی۔ یورینیم آہستہ آہستہ ٹوٹ کر سیسہ (لیڈ) بنتی ہے۔ اس عمل کو ریڈیو ایکٹیوٹی کہتے ہیں۔ اگر پتھر میں کچھ مقدار میں یورینیم اور کچھ مقدار میں سیسہ ہوتا ہے تو دونوں کو ماپا جاسکتا ہے۔ سائنس دان، گننے سے پتہ لگا سکتے ہیں کہ یورینیم کی کتنی مقدار کتنے سالوں بعد کتنا سیسہ بنائے گی۔ اس سے وہ پتھروں کی عمر کا پتہ چلا سکتے ہیں۔

اس تکنیک سے پہلی بار زمین کی صحیح عمر کا پتہ چلا کہ وہ سینکڑوں کروڑ برس پرانی ہے۔ بعد میں سائنس دانوں نے زمین کی صحیح عمر کو 400 کروڑ برس نکالا یعنی مروجہ نظریات کے برعکس زمین کی عمر 20 گنا زیادہ نکلی۔ یہ ایک بہت لمبا عرصہ ہے اور اس لمبے عرصے میں زمین کافی کچھ ٹھنڈی ہو جانی چاہیے تھی۔ اس کا مطلب یہ کہ زمین کا اندرونی حصہ اتنا ٹھنڈا ہوا ہوگا کہ اب اس میں سے آتش فشاں باہر نہیں نکلیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ آتش فشاں اب بھی پھٹتے ہیں۔

اس کا جواب پھر یورینیم میں ملا۔ جب یورینیم کے عناصر سیسے میں بدلتے ہیں تو اس عمل میں کچھ مقدار میں حرارت بھی پیدا ہوتی ہے۔ مگر یورینیم اتنا آہستہ آہستہ سیسے میں تبدیل ہوتا ہے کہ ہم ایک کلو یورینیم کے ذریعے گرمی کو محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اگر آپ زمین پر سینکڑوں کروڑوں ٹن یورینیم کے ذریعے حرارت کی مقدار ناپیں گے تو اس کی مقدار بہت زیادہ ہوگی۔

زمین کی تہہ میں یورینیم کے علاوہ بھی دیگر کئی ریڈیو ایکٹیو مادے موجود ہیں۔ اگر ریڈیو ایکٹیو مادوں کے ذریعے پیدا حرارت کی گنتی کی جائے تو وہ کتنی ہوگی؟ وہ مقدار لگ بھگ اتنی ہوگی جتنی حرارت زمین سطح کے باہر کے ماحول میں پھینکتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہماری زمین بالکل ٹھنڈی نہیں ہو رہی ہے۔ ریڈیو ایکٹیوٹی زمین کے اندرونی حصے کو لگاتار گرم کرتی ہے۔

اتنا ضرور ہے کہ جیسے جیسے یورینیم کی طرح کے مادے سیسے میں بدل رہے ہیں، ویسے ویسے ریڈیو ایکٹیو مادوں کی مقدار کم ہو رہی ہے۔ مگر ان ریڈیو ایکٹیو مادوں کی مقدار کم ہونے میں ابھی کروڑوں برس لگیں گے۔ تب تک ان کے ذریعے پیدا شدہ حرارت کی مقدار کافی اہم ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ ہماری زمین کو ابھی ٹھنڈا ہونے میں مزید سینکڑوں کروڑوں برس لگیں گے۔ جب زمین ٹھنڈی ہوگی تب اس کے پیٹ سے آتش فشاں نکلنا بند ہوں گے۔

اگر زمین کا اندرونی حصہ چہار جانب میں گرم ہے تو پھر کچھ خاص جگہوں پر ہی آتش فشاں کیوں پھٹتے ہیں؟ ایسا لگتا ہے کہ زمین کی کرسٹ ہر جگہ ایک جیسی مضبوط اور ٹھوس نہیں ہے۔ ایسی بھی جگہیں ہیں جہاں کرسٹ میں 'کمزور نقطے' ہوں، یا دراڑیں ہوں جن میں سے حرارت آسانی سے باہر نکل کر آسکتی ہے۔

کچھ جگہوں پر یہ حرارت زمین کی سطح کے بہت قریب آکر وہاں مٹی ملے پانی کو گرم کرتی ہے۔ اس سے گرم چشمے بنتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ پانی حرارت کی زیادہ مقدار سے اُبلنے لگتا ہے اور اس سے جو بھاپ بنتی ہے وہ پانی کو زمین کی سطح کے اوپر ہوا میں دھکیلتی ہے اور اس سے 'گیزر' بنتے ہیں اور اگر بہت زیادہ مقدار میں حرارت زمین کی سطح تک آتی ہے تو انہی سے آتش فشاں بنتے ہیں۔

کرسٹ پر کمزور جگہیں ساری زمین پر ہیں۔ اس پر آج پائے جانے والے 500 متحرک آتش فشاؤں میں سے لگ بھگ 300 پیسی فک سمندر کے آس پاس پائے جاتے ہیں اور قریب قریب 80 آتش فشاں انڈونیشیا کے جزائر میں پائے جاتے ہیں۔ آتش فشاؤں کی اس منحنی سطح کو اکثر 'آگ کا گھیرا' کہا جاتا ہے۔

آگ کا گھیرا

1800ء میں سائنس دان اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرتے رہے۔ کچھ کو لگا کہ کبھی چاند بھی زمین کا حصہ رہا ہو گا اور اس کے الگ ہونے سے زمین میں ایک بڑا گڑھا پیدا ہوا ہو گا جسے پیسی فک سمندر نے بھرا ہو گا۔ اس سے انھیں لگا کہ پیسی فک سمندر کے کناروں پر کچھ کمزور جگہیں پیدا ہوئیں جہاں سے اب آتش فشاں پھٹتے ہیں۔

سائنس دانوں کا یہ نظریہ بالکل غلط نکلا۔ اب سائنس دانوں کا ماننا ہے کہ چاند کبھی بھی زمین کا حصہ نہیں رہا۔ اگر ہم زمین پر سبھی آتش فشاؤں اور زلزلے کے مراکز کا ایک نقشہ بنائیں تو ہم دیکھیں گے کہ نقشے میں 'آگ کے گھیرے' کے علاوہ اور بھی کئی مقام ہونگے۔ زمین کے نقشے پر ہمیں بڑے بڑے ٹکڑے دکھائی دیں گے، جن کے کناروں پر یہ آتش فشاں اور زلزلے کے مراکز واقع ہونگے۔

1950ء کے آس پاس سائنس دانوں کو اس بات کے ثبوت ملے کہ زمین کے کرسٹ میں کئی بڑی بڑی پلیٹیں ہیں جو آپس میں مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ پلیٹیں دھیرے دھیرے کھسکتی ہیں۔ ویسے زمین کے مینٹل (اندرونی حصہ) میں پتھر ٹھوس ہیں، مگر وہ اتنے زیادہ گرم ہیں کہ وہاں پتھر ہلکے ہلکے پگھلے موم جیسے بہتے ہیں۔

سائنس دانوں کا ماننا ہے کہ زمین کے اندرونی حصے میں پتھر دھیرے دھیرے ایک گول دائرے میں بہتے ہیں۔ کرسٹ کے پیندے میں بہنے والی لہریں ان پلیٹوں کو اِدھر اُدھر کھسکاتی ہیں۔ کچھ پلیٹیں ایک دوسرے کو دور کھینچتی ہیں جبکہ دیگر ایک دوسرے کے پاس آتی ہیں۔ اس حرکت کے باعث پلیٹوں کے جوڑوں پر کمزور نقطے پیدا ہوتے ہیں جن میں سے حرارت اوپر بہہ کر آتش فشاں پیدا کر سکتی ہے۔

کوئی آتش فشاں کب متحرک ہو گا، کیا ہم اس کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں؟ ابھی تو نہیں۔ مگر جیسے جیسے ہم پلیٹوں کے کھسکنے کو بہتر طور پر سمجھیں گے، ویسے ویسے ہم آتش فشاں کب پھٹیں گے؟ اس کا بھی صحیح اندازہ لگا پائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم کسی آتش فشاں کو پھٹنے سے روک سکتے ہیں؟ اور اس سے پہلے کہ آتش فشاں میں ایک بڑا دھماکہ ہو، کیا ہم کچھ کر کے اس میں ایک چھوٹا دھماکہ کرا کے اس کی توانائی کو کم کر سکتے ہیں؟

ایسا کرنے کی آج ہمارے پاس ایسی کوئی تکنیک دستیاب نہیں ہے البتہ ہمارے علم میں لگا تار اضافہ ہو رہا ہے اور جیسے جیسے ہم زمین کو بہتر طور پر سمجھیں گے، ویسے ویسے ہمیں ان مشکل سوالات کے جوابات ملیں گے۔

5۔دوسری دنیاؤں میں آتش فشاں

کیا دوسری دنیاؤں میں آتش فشاں ہوتے ہیں؟ شاید ایسا سوچنا منطقی ہو۔ نظام شمسی بننے کے وقت اس کے بڑے سائز کے علاقے بہت گرم ہونگے۔ سطح کے آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ٹھنڈی پتلی پپڑی میں سے اندر کی حرارت باہر آ کر آتش فشاں پیدا کرتی ہو گی۔ کچھ چھوٹے علاقے خاص کر اتنی جلدی ٹھنڈے ہوئے ہونگے کہ وہاں آتش فشاں پھٹنے کا کوئی موقع ہی نہیں آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ان علاقوں کے اندر کا درجہ حرارت بہت زیادہ ہونے کے باوجود ان کی پپڑی اتنی سخت اور مضبوط ہوگئی ہو کہ وہاں آتش فشاؤں کے پھٹنے کے لیے کوئی کمزور جگہ ہی نہ ہو۔

ہمارے چاند پر ایسے بہت سے علاقے ہیں جہاں ہزاروں میل تک لاوا پھیلا ہوا ہے۔ یہ سب چاند کے ابتدائی دور کے دوران ہوئے ہونگے۔ اب وہاں پر آتش فشاؤں کے متحرک ہونے کے کوئی ثبوت نہیں ہیں۔1971ء میں میری نر-9 نام کے راکٹ نے مریخ سیارے کے مدار کا چکر لگایا۔اس نے مریخ کی سطح کی بے شمار تصاویر بنائیں اور ان سے پھر مریخ کا مکمل نقشہ بنایا گیا۔

مریخ پر بے شمار گڑھے، پہاڑ اور گھاٹیاں ہیں۔ایک علاقے میں بڑے پہاڑ اور گڑھے تھے جو دیکھنے میں بالکل آتش فشاؤں جیسے تھے۔اس میں سے سب سے بڑے کا نام اولمپس مونز ہے۔اولمپس مونز زمین پر پائے گئے کسی بھی آتش فشاں سے بڑا ہے۔اس کی چوٹی مریخ کی اوسط سطح سے کوئی پندرہ (15) میل اونچی ہے اور اس کا قطر 250 میل چوڑا ہے۔ زمین پر سب سے بڑا آتش فشاں ہوائی میں ہے۔اولمپس مونز ہوائی آتش فشاں سے دوگنا اونچا اور تین گنا چوڑا ہے۔اس سے بھی زیادہ اولمپس مونز کا گڑھا 40 میل چوڑا ہے جو زمین پر پائے کسی بھی آتش فشاں کے گڑھے سے بڑا ہے۔

جہاں تک ہم جانتے ہیں، اب اولمپس مونز اور مار آتش فشاں ختم ہو چکے ہیں۔اس لیے کہ لمبے عرصے سے ان میں کوئی تحریک نہیں دیکھی گئی۔ 1978ء میں پائی نیئر وینس نام کے راکٹ کو وینس کے مدار پر بھیجا گیا۔ وینس کے چاروں اطراف موٹے بادلوں کی پرت کے باعث اس کی سطح کو دیکھ پانا بہت مشکل ہے۔البتہ راڈار کی کرنیں بادلوں سے ڈھک کر سطح سے کرنوں کو چھپا دیتی ہیں۔ رڈار کے عکس کے ذریعے پائی نیئر وینس پر موجود آلات سے مریخ کی سطح کا لگ بھگ پورا نقشہ بنایا گیا۔

راڈار کے ذریعے جو پہاڑ مریخ پر دکھائی دیے تھے اُن میں سے کچھ آتش فشاں بھی تھے۔اُن میں سے ایک پہاڑ ریہا مونز کے نام سے جانا جاتا ہے جس کا سائز لگ بھگ نیو میکسیکو جتنا ہوگا۔اگر وہ درحقیقت آتش فشاں نکلا تو اس کا قطر مریخ کی سطح پر اولمپس مونز سے بھی بڑا ہوگا۔البتہ مریخ پر واقع آتش فشاؤں میں بھی زندگی ہونے کے کوئی ثبوت نہیں ملے۔

زمین کے علاوہ دوسرے کسی سیارے پر ابھی تک متحرک آتش فشاں

موجود ہونے کے بھی کوئی ثبوت نہیں ملے مگر 5 مارچ 1979 کو ایک راکٹ وویاجر-1 نے مشتری سیارے کے قریب کا سفر کیا اور اس کے سیٹلائٹس کا جائزہ لیا۔مشتری کے چار بڑے سیٹلائٹس ہیں جن کا سائز ہمارے چاند جتنا یا اس سے کچھ بڑا ہے۔مشتری کے سب سے نزدیک سیٹلائٹ کا نام لَو ہے۔اس کا سائز ہمارے چاند کے برابر کا ہے اور اس کی مشتری سے دوری بھی چاند کی زمین سے دوری جتنی ہے۔مشتری کی کشش ثقل اس کے سیاروں پر جوار بھاٹا پیدا کرتی ہے۔ان جوار بھاٹوں سے سیاروں کے اندرونی پتھر دبتے اور کھنچتے ہیں جس سے وہ گرم ہوتے ہیں۔لَو چونکہ مشتری کے سب سے نزدیک ہے اس لیے دیگر سیاروں کی نسبت وہ زیادہ گرم ہوتا ہے۔

وویاجر-1 کے مشتری کے نزدیک سے گزرنے کی وجہ سے کچھ ماہرین فلکیات کا خیال تھا کہ جیوپیٹر کے جوار بھاٹے کے باعث لَو کا درجہ حرارت آتش فشاں پیدا کرنے جتنا اونچا ہو سکتا ہے اور جب وویاجر-1 مشتری کے قریب سے گزرا اور اس نے لَو کی تصاویر کھینچیں تو وہاں واقعتاً میں آتش فشاں دکھائی دیے۔لَو پر متحرک اور پھٹتے ہوئے آٹھ آتش فشاں دکھائی دیے۔چار مہینے بعد وویاجر-2 نام کا ایک دوسرا راکٹ جب وہاں سے گزرا تو اُس وقت بھی چھ آتش فشاں متحرک تھے۔

لَو کے متحرک آتش فشاؤں میں سے نکلنے والے ملبے میں زیادہ تر راکھ اور گندھک تھی۔گندھک کی پرت کے باعث لَو کی پوری سطح لال، نارنگی اور پیلی دکھائی دیتی تھی۔سلفر ڈائی آکسائیڈ کے ٹکڑے ہونے کی وجہ سے یہ گیس سیارے کے لیے ایک پتلے ماحول کا کام کرتی ہے۔اس لیے ہم کم از کم دو ایسے خطوں کے بارے میں جانتے ہیں جہاں آتش فشاں حقیقت میں پھٹتے ہیں یعنی زمین اور لَو۔

زمین پر آتش فشاؤں میں ہماری بھرپور دلچسپی ہے کیونکہ سائنس میں ترقی کے باوجود آج بھی آتش فشاؤں میں لوگ مارے جاتے ہیں اور جب آتش فشاں پھٹتے ہیں تو ہم بے بسی کے عالم میں وہاں سے نقل مکانی کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پاتے۔

محمد ریاض خان IESE

کمپیوٹرائزڈ الیکٹرومکینیکل انسان

ایسے انسان کو روبوٹ کہا جاتا ہے۔ انسان ان سے معاشرتی اقدار، احساسات کی وجہ سے مختلف ہے جو مصنوعی ذہانت کہلاتی ہے۔

مکینیکل انسان

انسان کے تمام اعضاء کی حرکت آزاد اور خود مختار ہے جیسے فزکس کے قوانین۔ اس سسٹم کا مرکز انسان کا نظامِ انہضام ہے، جہاں (Combustion) سے توانائی تمام اعضاء کو خون کے ذریعے منتقل کی جاتی ہے۔ اضافی توانائی چربی کی صورت میں مختلف جگہوں پر محفوظ ہوتی رہتی ہے۔ اگر یہ استعمال نہ ہو تو اندرونی نظام کو خراب کر دیتی ہے۔ انسانی اعضاء میں مضبوطی اور تقویت توانائی کی فراہمی سے آتی ہے۔ اگر یہ سسٹم بند ہو جائے تو انسان مٹی کا ڈھیر رہ جاتا ہے۔ یہ خود کار نظام انسان اپنی ماں کے پیٹ سے ریڈی میڈ لے کر آتا ہے۔ جہاں نہایت زبردست سسٹم موجود ہے جس کا کام DNA کی مدد سے مکمل انسانی تصویر کی تخلیق ہے۔ وہ ماحول سے مطابقت حاصل کرنے کے لئے حسوں کا استعمال کرنا اور جسمانی نشوونما کرتا ہے۔ انسانی زندگی کی میعاد انسان سے مخفی رکھی گئی ہے جو انسان کو الہیاتی تخلیق بناتی ہے۔

الیکٹرومکینیکل انسان

انسانی دل کی اوسط دھڑکن 80-60 فی منٹ ہے۔ انسانی دماغ مختلف فریکوئنسی ملٹی پلائیر سگنلز پیدا کرتا ہے، جہاں سے تمام اعضاء کو کنٹرول کرنے کے لئے الیکٹریکل کنٹرول سگنلز، مسلز اور رگوں کے ذریعے بھیجے جاتے ہیں جس کی وجہ سے مطلوبہ حرکت عمل میں آتی ہے جبکہ انسانی جسم میں کچھ حرکات حرام مغز سے عمل میں آتی رہتی ہیں۔ کچھ محرکات بیرونی عمل (نفسیاتی) اور اندرونی عمل (کیمیاوی) سے پیدا ہوتے ہیں جو رگوں کے تناؤ کا سبب بنتے ہیں جس سے بلڈ پریشر (120-80) سے منحرف ہوجاتا ہے یعنی انسان میں Transistor switching کا تمثیلی نظام پایا جاتا ہے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جسم میں نئے سیلز کا نہ بننا اور موجودہ کا کم ہونا ہے جو الیکٹریکل کنٹرول سسٹم کمزور کرتا ہے جس کی وجہ سے بڑھاپے میں اپنے جسم پر بوجھ کم اور احتیاط بڑھانا پڑتی ہے۔

کمپیوٹرائزڈ الیکٹرومکینیکل انسان

مرکزی کنٹرول دماغ Programmed ہوتا ہے جس سے انسان کی I/P اور O/P کو ایڈریس، ڈیٹا اور کنٹرول سے رسپانس آتا جاتا ہے۔ جلد کی صورت میں فائر وال لگی ہوتی ہے۔ کمپیوٹر سسٹم DOS/BIOS سے سٹارٹ لیتا ہوا آپریٹنگ سسٹم میں آجاتا ہے۔ جبکہ انسانی بچہ اٹھ کر چلنے اور بولنے سے سارے ارتقائی مراحل طے کرتا جاتا ہے۔ جیسے اس کی

نسلوں نے ابتدائی انسان سے جدید انسان تک طے کیے تھے۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر میں مختلف لائبریریز ہوتی ہیں جیسے DLLs۔ انسان جب بھی کسی چیز کا تجربہ کرتا ہے تو اس کے متعلق نیوران سیلز کی ایسی فائل بننا شروع ہو جاتی ہے جو دماغ میں موجود ہارڈ ڈسک میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ یہ وقت اور تجربے سے اپ ڈیٹ ہوتی رہتی ہے۔ اسکے علاوہ کچھ DLLs اس کو تہذیب سے بھی ملاتی ہیں جو بیرونی یا رابطہ لائبریریز کہلاتی ہیں۔ جس کی سب سے بڑی مثال اس کے آبائی مذہب کی ہے جو والدین کی جانب سے ودیعت ہوتا ہے۔

انسانی دل

مندرجہ بالا انسان اور روبوٹ میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ انسان مشینوں سے مصنوعی ذہانت کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔ جہاں انسانی جذبات، احساسات اور اقدار پائی جاتی ہیں۔ کمپیوٹرائزڈ الیکٹرو مکینیکل انسان انہی چیزوں کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ جب انسان اس خول کو توڑ کر باہر نکلتا ہے تو کئی نئی چیزوں کا مطالعہ اور مقابلہ کرتا ہے۔ اس خول کو توڑنے کے لئے خود کی از سرِ نو تعمیر سے خرد فروزی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جس میں سزا اور جزا اور کچھ سماجی اصول وضوابط زیرِ بحث آتے ہیں۔

محمد ریاض خان، IESE

صحت کی باتیں

عالمی ادارہ صحت کے مطابق صحت مند انسان جسمانی، ذہنی اور سماجی صلاحیتوں کا بھرپور مالک ہوتا ہے۔ جو بیماری اور ضعف سے پاک ہو۔

جسمانی صحت

جسمانی صحت میں انسانی جسم کے تمام اعضاء کی حرکت شامل ہے۔ جس میں جسم کے اندر کے نازک اعضاء، بیرونی جسم کے اعضاء اور پٹھے شامل ہیں۔ اسکے اردگرد کا ماحول، رہن سہن، اوقات کار، خوراک اور ورزش کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں بتاتی ہے کہ فطرتی انتخاب ہمیشہ ہر جاندار پر اثر انداز ہوتا ہے جو اس کے ساتھ موافقت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنی بقاء قائم رکھتا ہے۔ یعنی یہ بقاء کی جنگ ہے، ورنہ وہ جاندار جو تاریخ کا حصہ ہیں اور آج موجود نہیں ہیں، یکدم صفحہ ہستی سے غائب نہیں ہوگئے۔ انکے جسمانی اعضاء نے ماحول کیساتھ مطابقت اختیار نہیں کی، جو مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر ناپید ہوئے۔ ڈارون کا فطرتی انتخاب کے بارے میں بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جب بھی انسان ارتقائی مراحل (شکاری سے کاشتکار اور کاشتکار سے صنعتکار) سے گزرا ہے، اس کو کافی تبدیلیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جس میں مختلف اعضاء میں تبدیلی قابل ذکر ہے۔

صنعتی ترقی نے انسان کے لیے کافی سہولیات کا بندوبست کیا جو اسکی جسمانی مشقت کو کم سے کم کرتا جا رہا ہے۔ اس لئے اس کے جسم کے اندرونی، بیرونی اعضاء اور پٹھوں کی تندرستی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہوا ہے۔ اس طرح کے مسائل ان لوگوں کی زندگیوں میں واضح نظر آسکتے ہیں جنکی ٹیکنالوجی سے زیادہ واقفیت ہے جیسے گرمیوں میں ایئر کنڈیشنر، سردیوں میں ہیٹر اور پُر آسائش رہائش وغیرہ۔

ذہنی صحت

انسان کی سوچ اسکی شخصیت پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ انسان کی عقل ہی اس کو تمام جانوروں سے ممتاز اور جدا کرتی ہے، جس میں دو چیزوں کا موازنہ کرنا، بہترین منتخب کرنا اور اس کے ساتھ دلیل قائم کرنا سرِ فہرست ہے۔ جبکہ ذہنی صحت سے انسان کی فکری قوتیں بحال ہوتی ہیں۔ جس سے ڈر کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ خود پر اعتماد اور اپنی قابلیت پر اسکا انحصار مضبوط ہوتا ہے۔ جس سے خوشحالی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ ورنہ دلیل نہ رکھنے کی صورت میں دوسرے لوگوں کا آلہ کار بنتا رہے گا۔ جب تک کہ وہ اپنی ناقص عقل کو عقل سلیم کی طرف گامزن نہ کرلے۔

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے، اس کی اپنی عقل پر الہٰیاتی تصور کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جس سے دلیل کی طاقت کم سے کم ہوتی گئی۔ مادی جسم رکھنے والے انسان نے خود کو غیر مادی محرکات کا سبب

سمجھا اور خود کو کسی طرح لافانی کرنے کی کوشش میں دنیا کو نظرانداز کیے رکھا۔ اس راہ میں عقل کو سب سے ناقص چیز سمجھا اور صدیوں پرانے جامد تصورات اور عمل کو بغیر عقلی دلیل پر پرکھے خود پر حاوی رکھا۔

سماجی صحت

اکثر لوگوں نے انسان کو سماجی جانور کہا ہے۔ انسان نے تمام انواع سے ترقی حاصل کرنے اور اس کو مل جُل کر چلانے سے روانی حاصل کی ہے۔ کیونکہ ترقی کے ساتھ ساتھ روزمرہ کے کام آپس میں مل بانٹ کر کرتا آیا ہے تو اسکی پہچان معاشرے سے بنی۔ دو یا دو سے زیادہ لوگ مل کر ایک نظام مرتب کرتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف نظام ملیں تو معاشرہ بنتا ہے۔ ایک انسان ایک معاشرے میں مختلف نظام میں مختلف کردار کا حامل ہوتا ہے اس طرح کے مختلف نظاموں میں رہنے کے لیے اسکے کردار میں اخلاق کا ہونا لازمی ہے۔ ذہنی سے جسمانی، جسمانی سے سماجی رابطے کا باہم گہرا تعلق ہے۔ نتیجتاً انسان کی صحت کا راز اس کی ذہنی صحت پر منحصر ہوتا ہے۔

اگر اسلام کو نماز کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ہمیں جسمانی، ذہنی، سماجی صحت اور وقت کی پابندی سکھاتی ہے۔

محمد عثمان اختر

چندا

دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں لاہور سے آنے والی ریل سٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔سواریوں کی دھکم پیل شروع ہو چکی تھی۔تِل دھرنے تک کی جگہ نہ تھی۔ایسے میں ایک عمر رسیدہ بڑھیا اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے ڈبے سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ایسا نہیں تھا کہ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔وہ دھیرے دھیرے چلتی،کھانستی ہوئی سٹیشن سے باہر نکل آئی۔باہر ایک گُل فروش کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔اتنا چلنے سے ہی اُس کی سانس رُکنے لگی تھی۔

''بیٹا۔'' اُس نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے گُل فروش سے کہا۔

''جی خالہ۔''گُل فروش نے ادب سے جواب دیا۔

''تھوڑا سا پانی تو پلاؤ خالہ کو۔''بڑھیا نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

گُل فروش نے فوراً ایک پیالے میں پانی بڑھیا کو پیش کیا۔

''اللہ تمہیں بہت نوازے۔'' بڑھیا نے پانی حلق سے اُتار کر کہا۔پھر کھانسنے لگی۔

''کہاں سے آئی ہو خالہ؟''گل فروش نے پوچھا۔

''لاہور سے آئی ہوں،اپنے بیٹے سے ملنے۔''بڑھیا نے کھانسی کے وقفے میں کہا۔''ایک گلاب کا پھول کتنے کا ہے بیٹا؟''

''خالہ دس روپے کا ہے۔''گل فروش نے جواب دیا۔''بیٹے کے لیے لے جاتی ہو خالہ؟''

''ہاں بیٹے کے لیے۔''بڑھیا نے چادر کے پلو سے گانٹھ کھول کر دس روپے گُل فروش کے ہاتھ پہ رکھ دیے۔گُل فروش گلاب کا پھول اُسے تھماتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اپنے بیٹے کے لیے گلاب کا پھول کون خریدتا ہے؟

بڑھیا نے ہاتھ دے کر رکشہ روکا اور جگہ بتا کر ہانپتی ہوئی رکشے میں سوار ہو گئی۔اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے وہ اردگرد کا جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ بیس برس کے بعد بھی وہ شہر کی ہر سڑک سے واقف تھی۔سوچ رہی تھی کہ یہ رکشے والا اگر راستہ بھول بھی جائے تو وہ پیدل اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ سکتی ہے پر ٹانگوں میں اب وہ کس بل نہیں رہا تھا۔پندرہ بیس منٹ میں وہ اپنی منزل پر پہنچ چکی تھی۔

ہولے ہولے چلتے ہوئے وہ بڑے دروازے سے قبرستان میں داخل ہو گئی اور سیدھا وہاں پہنچ گئی جہاں وہ پہنچنا چاہتی تھی۔اپنا چھوٹا سا بستہ وہ قبر کے ساتھ رکھ کر بیٹھنے لگی مگر پھر یکدم ایک خیال سے قبر کو اپنے ہاتھ سے صاف کرنے لگی۔قبر پر اُگی ہوئی گھاس کو ہاتھ سے اُکھاڑتی ہوئی وہ سوچ رہی تھی بیس برس بعد بھی وہ یہ جگہ بھول نہیں سکی حالانکہ وہ یہاں صرف ایک دفعہ آئی تھی جب شہر چھوڑتے ہوئے اُس کا خاوند اُسے یہاں لے آیا تھا۔کٹھن وقت تھا۔شہر چھوڑنا بھی ضروری تھا۔

قبر صاف کرتے ہوئے دھول سے اُسے کھانسی کا ایسا دورہ پڑا گویا جان

نکلنے کو ہو۔ بہت سا کھانس کر اُس نے چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ پھر جب قبر تھوڑی صاف ہو چکی تو چادر کا ایک سِرا زمین پر بچھا کر وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی جیسے ابھی کچھ دیر بیٹھے گی۔

''السلام علیکم۔ کیسے ہو چندا؟'' وہ تھوڑا جھک کر قبر سے ہمکلام ہو کر بولی۔''جانتی ہوں تم خفا ہو گے۔ ہونا بھی چاہیے۔ شہر چھوڑ دیا، مڑ کر نہیں دیکھا۔ تمہیں مجھ سے ناراض ہی ہونا چاہیے۔ مگر ماں تو اپنے بچے سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ دل لاکھ چاہے، ماں سے ایسا ہو نہیں پاتا۔ لیکن اب کے آنا ہی پڑا چندا۔'' اِتنا کہہ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ پھر کھانسی نے آلیا تو کچھ دیر کو خاموش ہی رہی۔

''آئی تو ہوں بہت کچھ کہنے سنانے کو لیکن یہ قدرت پر منحصر ہے جتنی بھی مہلت دے دے۔ پہلے تو آنے کا مدعا بیان کروں گی۔ بات کچھ یوں ہے کہ تم سے ملاقات کا رستہ تو اب حتمی طور پر نکل ہی آنا تھا کہ ٹی۔ بی کے طبیبوں نے مجھے لاعلاج قرار دے ہی دیا ہے۔ میں تو بہت پہلے ہی موت کا یہ سرٹیفکیٹ لے لینا چاہتی تھی مگر آقا کا حکم نہ ہوا تھا۔'' اتنا کہہ کر مسکرا کر قبر کی طرف دیکھنے لگی۔''یہ پل بھر کی مسکان تو اِس لیے ہے کہ بیس برس پہلے لوگوں نے کہہ دیا تھا چندا مر گیا۔ اب چندا کی ماں کیسے جئے گی؟ ایک اکلوتا بیٹا' مشکل سے چوبیس برس کا، جہان بھر کا لاڈلا، حسن جس کا لاثانی، اخلاق جس کا مثلِ شمع۔۔۔ لیکن جی لیا۔ بہت جی گئی۔ اب سوچتی ہوں تُو بھی سوچتا ہو گا کہ کیسی ماں ہے کہ میرے بغیر اِتنا جیتی گئی۔ ہاں جی لیا بیٹا، مگر بتانے سے کیا ہوتا ہے کہ کیسے جی لیا۔ دِل پر زخم ایسا لگا تھا کہ نہ بھرتا تھا نہ جان کو آزاد کرتا تھا۔ ہاں کہتی تو تھی کہ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے، تیری صورت سے ہی میرا جہان آباد ہے۔ لیکن کیا کرتی چندا؟ اُس آقا سے گلہ تو نہیں کر سکتی تھی کہ مجھے طاقت اور ہمت نہ دے۔ منہ سے تو اپنے لئے موت نہیں مانگ سکتی تھی کہ یہ تو بڑا سخت گناہ ہے۔'' کھانسی سے پھر کلام میں خلل پڑ گیا تو چند منٹوں کی خاموشی نے بسیرا کر لیا۔

''خیر، اب تو جہان سے اُٹھنے کو ہوں۔ تم سے ملاقات کا وقت قریب آن پہنچا ہے۔ اپنے ابا سے تو عالمِ ارواح میں ملاقات کر چکے ہو گے کہ نہیں؟ وہ بھی اچھا ساتھ نبھا کر گئے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد جب بہت بیمار رہا کرتے تھے تو میں اکثر ڈر جاتی تھی کہ شاید یہ بھی اجازت لینے کو ہیں، تب مجھ سے کہتے تھے تمہیں تنہا نہ کروں گا۔ تم سے جفا نہ کروں گا۔ اب دیکھ لو، خود بھی چل دیے۔ اجازت کی تو خیر کیا بات ہے، تم نے کونسی اجازت لی تھی؟ سان نہ گمان، تم جہان سے سِدھار لئے۔ مرگِ جواں سال اور مَیں بڑھیا۔۔۔ بس لوگوں سے یہی سنتی رہ گئی کہ جوان بیٹے کی موت کے بعد بڑھیا کی کیا زندگی؟ اور میں خود سے کہتی رہی کہ جوان بیٹے کی موت کے بعد اِس بڑھیا کی کیا موت؟'' بڑھیا ہنسنے لگی۔''اب جو موت آئے گی تو کس بات کا خوف؟ روح تو کب کی قبض ہو چکی۔ جب تم میت بنے میرے آگے پڑے تھے، میں نے اِس جہان کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ لیکن پھر کیا کرتی' تم مجھے اِتنا کچھ دے کے چلے گئے کہ دل کا تھوڑا سا حصہ ہمیشہ جاندار ہی رہا۔ تمہاری جورو نے مجھے ایسا تھاما کہ جینے کی خواہش ایک چنگاری سی بن کر دل میں سلگتی رہی۔ تم اگر چندا تھے تو وہ بھی اِس ہٹ پر قائم رہی کہ وہ چاندنی ہے۔ تم چلے گئے لیکن اپنی پرچھائی چھوڑ گئے۔ بھلی مانس کو کہتی رہ گئی دوسرا بیاہ کر لے۔ اِس جوانی میں کیوں ہم بڈھوں سے لگی پڑی ہے مگر مجال ہے جو ٹس سے مس ہوئی

ہو۔کہتی رہی کہ جس سے ایک دفعہ وفا کا پیمان کیا' اُس سے منہ نہ موڑوں گی۔تم بھی تو مرتے مرتے اُس کی جھولی بھر گئے۔ اُسے امید سے کر گئے۔اور اِس اُمید سے بھی کہ تم لوٹ آؤ گے۔ پرنہیں،تم نہ لوٹے۔نو مہینے جس عذاب میں اُس نے کاٹے،شاید یہ بیس سال بھی اُتنے سنگلاخ نہ تھے۔لیکن پھر جب تمہارا ننھا چاند پیدا ہوا تو دل میں جیسے بہار کا گمان ہوگیا۔تمہارے ابا نے تو کتنی ہی راتیں رورو کر گزاریں۔تب تم اُنہیں بہت یاد آیا کیے۔'' کھانسی پھر رخنہ انداز ہوئی مگر اب کے یہ چپ نہ ہوئی۔''اِس بد بخت کھانسی نے جسم کا ستیاناس کر دیا۔خیر، بتا یہ رہی تھی کہ تمہارا چاند جس نے ہمیں تمہارے غم سے تھوڑا بہت غافل کر دیا تھا جب کوئی جوان ہوا تو عین بین تمہاری ہی صورت کا انسان نکلا۔کمبخت کو جب دیکھا،تمہاری یاد نے ستایا۔ایسے دل پر کچوکے لگائے کہ تمہارا نہ ہونا اور بھی کھلنے لگا۔دل ہر وقت ایک اضطراب میں مبتلا۔۔۔ہاں یہاں اِقبال جرم کرتی ہوں کہ تب آقا سے موت مانگا کرتی تھی۔مگر پھر تمہاری چاندنی نے میری بہت ڈھارس بندھائی۔ اور وہ تمہارا چاند۔۔کتنا کہا کرتی تھی تم سے کہ اُلٹے سیدھے گانے مت گایا کرو۔اب مانو یہ خدا کی قدرت ہے یا اُس نے ماں کے پیٹ سے تمہیں گاتے سُن لیا۔ گلے میں ایسا لحن لے کر پیدا ہوا کہ جب کوئی راگ الاپے تو لگے جیسے کہیں دور کوئی جوگی بانسری بجا رہا ہے اور میں بنا مطلب کے تمہیں یاد کرنے لگتی۔لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تمہارا جنازہ اُٹھتے ہی بہو بے ہوش ہوگئی۔سب نے سمجھا کہ صدمہ سہار نہیں پائی مگر ایک دو دن بعد میں بھانپ گئی کہ اُمید سے ہے۔پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ننھے چاند نے تمہیں گاتے سُن لیا ہو؟ تب تو اُس کی شکل تک پیٹ میں بنی نہ ہو گی،جانے کانوں سے سُن کیسے لیا؟

''پھر تمہاری گڑیا جسے تم نے اپنا دیوانہ کر رکھا تھا،تمہاری میت سے لپٹی رہی۔کہتی رہی کہ ابا اکثر یونہی سونے کا دھوکہ دیتے ہیں پھر یکدم جاگ جاتے ہیں۔تم کھیلتے ہو گے اُس سے ایسے سہانے سیدھے کھیل۔۔۔ بہت سمجھایا کہ اب نہ اُٹھیں گے تمہارے ابا لیکن بچوں کا یقین بھی بڑا ہی پکا ہوتا ہے۔بجلی کی ننگی تاریں تم پر گریں اور تم چلے گئے مگر تڑپتی تمہاری گڑیا رہی۔ بہت رویا کی۔ بہو کتنا سنبھالتی کہ ننھا چاند بھی اُسے اندر ہی اندر بہت ستا رہا تھا؟ شاید جان گیا تھا کہ دکھوں کے گھر میں قدم رکھنے کو ہوں۔ہاں وہ وقت بڑا کٹھن تھا،کچھ کھاتے نہیں تھے۔بس زہر مار کرتے تھے۔سوتے نہ تھے،تمہاری یاد سے بس آنکھوں کو سینچتے تھے۔تب بھی ایک دو بار آقا سے موت مانگی ہوگی۔مگر یقین کرو تب تمہاری گڑیا کی موت زیادہ مانگی کہ اُس کا رونا مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا۔تب تمہارے ابا نے بہو سے بہت کہا کہ دوسرا بیاہ کرلو۔بن باپ کے یہ بچوں کا بار اور پہاڑ جیسی زندگی۔۔۔لیکن وہ کیا گڑیا سے کم دیوانی تھی تمہارے پیچھے؟'' وہ ہنسنے لگی۔''اکثر آٹا گوندھتی تو تمہارا نام انگلیوں سے آٹے پر لکھا کرتی۔جب تک ننھے کا دودھ چھوٹ نہیں گیا' کسی سے ملی تک نہیں۔

''تمہاری بہنوں نے تمہارا غم کر کر کے مجھے اور بھی پریشان کیا۔تم بھی ایسے تھے ہر ایک کے خواب میں آتے رہے اور مجھ سے روٹھے ہی رہے۔ میں ماں تھی،تمہاری صورت کو مجھ سے زیادہ کون ترسا ہوگا؟ مگر تم نے میری طرف نگاہِ کرم نہ کی۔سب مجھے بتاتے رہے کہ تم اُن کے خوابوں میں آتے ہو اور میں نیند کے آنے تک یہی دعا کرتی رہتی کہ تم آجاؤ۔تم نہیں آئے۔خیر،تم جب جاتے ہوئے ہی بتا کر نہیں گئے تو تمہارے

خواب میں نہ آنے کا گلہ تو بڑا ہی بے تکا سا ہے۔ بہنوں کو خواب میں آ کر کہتے رہے کہ وہاں بہت خیر سے ہو۔ سُن کر خوش ہوتی رہی۔ لیکن چاہتی تھی کہ تمہیں اپنی آنکھوں سے خواب میں کہتے ہوئے بھی دیکھ لوں۔ تمہارے ابا کہتے تھے کہ اچھا ہی ہے کہ چندا تمہارے خواب میں نہیں آتا۔ ورنہ تم روز اُس کا انتظار کرو گی۔ اور یہ انتظار تو دوہرا عذاب ہوگا۔ اب سوچتی ہوں شاید یہ بھی مصلحت کے تحت ہی تھا کہ تم نہ آئے۔ مگر اُن دنوں میں جب سو کر اٹھتی اور یادداشت کے کسی حصے میں تمہاری دید نہ پاتی تو آقا سے موت مانگا کرتی۔ ہاں تب شاید یہ گناہ مجھ سے کافی بار سرزد ہو گیا تھا۔'' کھانسی ایک بار پھر وارد ہوئی تو وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور قبر سے منہ موڑ کر بولنے لگی۔

''آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ کہتے ہیں کہ ماں کے مرنے کا غم بہت جانکاہ ہوتا ہے۔ اب تمہیں تو جانے کی وہ جلدی تھی کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ بس چل دیے۔ دکھانے آئی تھی کہ فرشتۂ اجل تاک میں بیٹھا ہے اور وقت ہے کہ تم دیکھو کہ ماں مرتی ہے تو تمہیں کیسا گھاؤ لگتا ہے؟ ممکن ہے تم سے سہا نہ جائے اور جاگ پڑو۔ کیونکہ تمہارے مرنے پر تو لگا تھا کہ کلیجہ پھٹ جائے گا اور پھٹتے ہوئے باقاعدہ ایک دلدوز آواز بلند ہوگی۔ ایسا ہوا نہیں، وہ الگ بات ہے۔ لیکن قسمت آزمانے چلی آئی۔ ماں ہوں ناں' ہر ہر راہ پر بیٹھوں گی جہاں سے تمہارے آنے کی امید ہوگی۔'' اِتنا کہہ کر پھر چادر کا سرا نچھا کر بیٹھ گئی۔

''بہنوں کی شادی کی، زمانے نے دیکھا۔ محنت مزدوری کر کے ماں باپ کو کھلایا، شادی کی اور جورو کے دل میں ساس اور سسر کا وہ پیار ڈالا کہ آج تک گیا نہیں، لوگوں سے وہ ناطہ بنایا کہ تمہاری رحلت کے بعد ہمیں بچوں کی طرح زمانے نے پالا۔ کیا سکھ ہے جو تم نے جیتے جی ہمیں نہیں دیا؟ پر جب گئے تو جیسے جہان بھر کا دکھ دے گئے۔ تمہارے ابا نے کہہ دیا کہ اب اِس شہر میں نہیں رہیں گے۔ میں کیا کرتی؟ کیا کہہ پاتی؟ تمہیں چھوڑ کر جانے سے ہی بات بنتی تھی۔ اُن کا فیصلہ صحیح تھا۔ آج شہر کی فضاؤں نے یکدم سب زخم ہرے کر دیے۔ یہاں رہتی تو جانے تمہاری یادیں کیسے کیسے وار کرتیں۔ ہائے! کیسے بتاؤں کہ اولاد جسے اپنے ہی بطن میں نو ماہ پالا ہو، اُسے جنم دے کر خود سے الگ ہوتا دیکھنا کیسی درد کی بات ہے۔ جسے ایسے جوکھم سے اپنی زندگی میں لایا جائے اور پھر کسی کی مرضی سے چلتا کیا جائے تو کیسے جان پر بن آتی ہے۔ خیر، کسی کی کیا؟ آقا کی مرضی تھی مگر یہ کیسی بات ہے کہ ماں کو ایسا دکھ دکھایا۔ پھر ایک ہی ماں کیا؟ ایک سے بیٹا چھینا اور ایک سے اُس کے ہونے والے بچے کا باپ۔۔۔ گلہ نہیں کر سکتی کہ وہ سب جہانوں کا پالنے والا ہے لیکن اپنے نالوں کو دل میں بھی تو دبا کر نہیں رکھا جا سکتا۔

وہ جو کہتی ہوں کہ کلیجہ پھٹتا ہے تو یونہی تو نہیں پھٹتا

''تمہاری چاندنی نے میری سیوا میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ میں نے اُس غریب کو بھی کیسا ستائے رکھا۔ تمہارے ابا کی پنشن سے گھر کا خرچہ کتنا چل جاتا چندا؟ دو بچوں کا پڑھنا لکھنا، اُن کی پرورش، میرا بوجھ اور تمہارے ابا کی بیماری۔۔۔ بوجھ تو بڑھتے بڑھتے وبالِ جان ہو گیا۔ ایسے میں بہو نے کیا کیا نہ کِیا۔ گھر سے نکل کر ہمارے جہان میں رہنے کے عرصے طویل کرتی گئی۔ تم جو ایسے نخرے کرتے تھے کہ اِس سے بیاہ نہ رچاؤ گے، جانے کیا بات تمہاری طبیعت کو ناگوار گزری تھی۔ حق تو یہ ہے کہ تم

شادی کے نام سے گھبراتے تھے۔وہ تمہارا دوست، راشد۔۔۔وہ تمہیں بدظن کردیا کرتا تھا۔خود جواپنی بیگم سے تنگ تھا۔جانے لوگ ایسا کیوں کیا کرتے ہیں کہ اپنے تجربوں کے نتیجے سب حالتوں پر لاگو کردیتے ہیں؟تم اِسی لئے اِس رشتے سے بھی خائف نظر آئے۔ پر میں جانتی تھی کہ اِس جیسا کوئی ملنے کا نہیں۔تمہیں تو جو سیر کیا سو کیا،تمہارے نام پر جو اپنا دامن پاک کرکے بیٹھی رہی، زمانے نے رشک کیا ہے شیر کی بچی پر۔۔۔کیا ہے جواُس نے نہیں کیا؟تم تو اپنا کام بھی اُسے دے کر چلے گئے۔آفرین ہے اُس ذات پرجس نے تم سے گلہ تک نہیں کیا۔آٹے پر تمہارا نام لکھتی رہی، مجھ سمیت بچوں کا کپڑا لتا پورا کرتی رہی۔خود تو بھلے سے عید بھی پیوند لگے کپڑوں میں گزار دیے۔ بہت جگرداد عورت ہے۔اب جو طبیبوں نے میری بیماری سے مایوسی ظاہر کی ہے تو سوچتی ہوں تمہاری چاندنی کو پھر اکیلا کر کے اُس آقا کی مجلس سے اِس کی صبر کی انتہا دیکھوں۔کیا کہتے ہو؟''وہ یکدم ہنس پڑی۔''خیر،تم کیا کہو گے۔تم نے تو ہم سے ایک آخری ملاقات کے لئے بجلی کی ننگی تاروں سے چند گھڑیوں کی مہلت تک نہ مانگی، ایک ساعت میں جان دے دی۔ پھر تمہارے ابا نے وفا نہ کی اور اب میں۔۔۔ڈر ہے کہ وہ نیک بخت قیامت کے روز مجھ سے باز پرس کرے گی۔میرا دامن پکڑے گی،مجھ سے انصاف چاہے گی۔لیکن مجھ سے بہت اُنس رکھتی ہے۔میرے صدقے تمہیں بھی معاف کردے گی۔بس دل ہی ایسا پایا ہے آقا کی طرف سے۔جو بیس سال بعد بھی تمہاری بے وفائی کا بدل یوں دے کہ نیند سے ہڑبڑا کر تمہارا نام لے کر اٹھے،وہ تمہیں روزِ محشر کسی امتحان میں نہیں رکھے گی۔'' یکدم کھانسی کے دورے نے بڑھیا کی جان کھینچ کر رکھ دی۔سانس بحال ہوئی تو پھر گویا ہوئی۔''یہاں تم سے دنیا کی باتیں کرنے آئی ہوں۔تم بھی کہتے ہو گے کہ ماں اپنے دکھ سنانے آئی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہاں تم سے یہ سب اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تم سے ملاقات کے وقت کوئی اور بات دل میں رکھنا نہیں چاہتی۔یہاں تو منہ آئی کہہ رہی ہوں مگر آقا کی مجلس میں تمہیں بس سینے سے لگا رکھوں گی۔پھر کہیں جانے نہ دونگی۔

''تمہارے بچے اب بہت خوشحال ہیں،آقا کا شکر ہے۔گڑیا اپنے گھر سدھار گئی۔تمہاری چاندنی بہت روئی۔کہتی رہی بن باپ کے بچی کتنے ارمان مار کر اپنے گھر چلی گئی۔اُس کے سسر کی بھی سن لو۔بیوی مرگئی تو بیٹے کی شادی اِسی شرط پر کی کہ ساتھ میرا بھی بیاہ ہوگا۔یوں تمہاری گڑیا کو نئی نویلی ساس بھی مل گئی۔میں سوچ رہی تھی کہ تمہاری چاندنی اگر ایسی کوئی شرط رکھتی تو شیطان کے کان بہرے،گڑیا ہمیشہ کے لئے گھر میں بیٹھی رہ جاتی۔زمانہ بھی بہت بگڑ گیا چندا۔اب کسی کے مرنے کا غم بھی نہیں ہوا کرتا۔مجھے تو یہ بھی کھٹکا ہے کہ جانے لوگ میری میت کو اپنی حاضری کے قابل بھی سمجھیں گے کہ نہیں؟ تم اچھے وقت میں اِس جہان سے اُٹھے ہو۔خیر، ماں کا دل تو ہر زمانے میں ایک سا ہی ہے۔آج بھی مرتے تو جی مار کر بیٹھتی۔ماؤں کا دل تو تنکوں کا گھر ہے۔ذرا سی غم کی آندھی چلی اور یہ گھر تہس نہس ہوگیا۔''وہ پیار سے قبر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''تمہارا چاند تو اب آقا کے حکم سے کمانے لگا ہے۔ماں کو کھلاتا ہے، مجھے کھلاتا ہے،میری دوائیں لاتا ہے۔پڑھ رہا ہے مگر نوکری بھی کر رہا ہے۔دیکھ رہی ہوں کہ جلد ہی افسر لگے گا۔مجھے بہت چاہتا ہے۔اب تم سا بھی نہیں دِکھتا۔کہنا مشکل لگتا ہے لیکن تم سے اچھی صورت کا ہے۔کیا ہاتھ پیر نکالے ہیں! بھیڑ میں چلتا ہوا نمایاں ہوتا ہے۔تمہاری وفات کے تین

سال بعد تمہاری بڑی بہن کو اللہ نے تیسری بیٹی دی تو میں نے اُسی وقت تمہارے چاند کے لیے اُس کو مانگ لیا۔ اچھا ویسے تمہارے چاند کو بھی تمہاری طرح ساگودانے کی کھیر بہت پسند ہے۔ یاد ہے جب ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ تو میں جنت میں آقا سے بھی طلب کرونگا۔ جب کبھی تمہارے چاند کے لئے کھیر بناتی ہوں، مجھے وہ بات یاد آجاتی ہے۔ ہاں، تب کبھی کبھی تم سے ملنے کا بہت دل چاہتا تھا تو موت مانگ لیا کرتی تھی۔ خیر، اب کسی سے کہہ نہیں سکتی کہ دفناتے ہوئے ساگودانے کی کھیر بھی کفن میں باندھ دے۔ ورنہ لے آتی۔'' اب جو کھانسی آئی تو بڑھیا پندرہ بیس منٹ کے لیے خاموش رہی۔

''جانتے ہو؟ وقت قریب ہے۔ لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ تمہاری چاندنی تو بہت ماند پڑ جائے گی۔ اور یہ ابھی جو کھانسی کا دورہ پڑا ہے تو صریح امکان ہے کہ ملک الموت چند گھنٹوں میں مجھ تک آتا ہی ہوگا۔ جانا بھی نہیں چاہتی لیکن مرنے سے پہلے اُس بھلی مانس کا چہرہ دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ اُس کو بتا کر بھی تو نہیں آئی۔ چپکے سے صبح کی ریل پر سوار ہوگئی۔ ایسی طبیعت میں تو وہ مجھے پلنگ سے پیر بھی نیچے رکھنے نہیں دیتی۔ اب چاہتی ہوں کہ چار بجے کی ریل سے واپس لاہور چلی جاؤں۔ ورنہ اِس ارمان سے مروں گی کہ کاش وہ پری چہرہ دیکھ لیتی۔ تم بول سکتے تو پوچھتی تم کتنے ارمان سینے میں لئے جہان سے کوچ کئے۔ تم سے تمہارے ادھورے ارمان آقا کی محفل میں پوچھوں گی چندا۔ خیر' ایک ارمان تم سے جیتے جی ملنے کا تو پورا ہوگیا۔ اب آخری ارمان تمہاری چاندنی کو آخری بار دیکھنے کا ہے۔'' کھانستے کھانستے بستے سے گلاب کا پھول نکالا اور قبر پر رکھ دیا۔ ''یہ تمہاری چاندنی کی جانب سے اپنے چندا کو۔ جھوٹ ہوگا اگر کہوں گی کہ اُس نے وہاں سے بھیجا ہے۔ اگر وہ خود آتی تو تمہارے لیے ایک نہیں، کئی پھول لاتی۔ بس اسی لیے میں اُس کی طرف سے تمہیں یہ دے رہی ہوں۔'' اتنا کہہ کر بڑھیا اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''تمہیں گلے سے لگانا چاہتی ہوں۔ چند گھنٹوں میں تم تک آ تو رہی ہوں مگر اس جہان میں بھی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتی ہوں۔'' اِتنا کہہ کر وہ قبر سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

چار بجے کی ریل سے وہ لاہور پہنچ گئی۔ رات کے دس بجے کے قریب جب وہ اپنے محلے کے قریب پہنچی تو ایک بچہ اُسے اندھیرے میں بھی پہچان گیا اور بلند آواز میں کہنے لگا ''چاند کی دادی ماں! چاند کی دادی ماں۔''

جب بڑھیا کو اُس کے گھر کے دروازے تک لایا گیا تو چندا کی چاندنی دوڑی ہوئی آئی اور چاند کی دادی ماں سے لپٹ گئی۔ وہ روتی جا رہی تھی۔ چاند کی دادی ماں نے اُسے خود سے چھڑا کر اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور مسکرا کر دیکھنے لگی۔ اِسی مسکراہٹ سے اُسی لمحے جان دی اور اپنے آقا کی محفل سدھار گئی جہاں غالباً چندا اُس کا منتظر تھا۔

۲۳ اکتوبر ۲۰۱۶ء

افسانہ

سین شین

آج پھر مقصود کی زبان اسے دھوکہ دے رہی تھی، لفظ اس کے منہ سے آسانی سے نہ نکل رہے تھے، پھسلتے پھسلتے جا رہے تھے۔ صبح جب وہ کالج گیا تو انگریزی کے لیکچرار سے بات کرتے ہوئے اٹکا، پھر ایک دو شناساؤں سے بھی گفتگو کرتے ہوئے یہی واقعہ پیش آیا۔ گھر لوٹا تو بہن کی سہیلی آئی ہوئی تھی۔ اس کی کسی بات کا جواب دینے لگا تو زبان جیسے گھوم سی گئی ہو اور لفظ جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئے ہوں۔ وہ اندرونِ شہر کا رہنے والا تھا اس لیے بعض اوقات ''ر'' کو ''ڑ'' اور ''ڑ'' کو ''ر'' بھی کہہ دیتا تھا لیکن کبھی کبھار بولتا وہ بالکل صاف تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ کوئی لفظ بھی اس کے منہ سے صاف نہ نکلتا۔ اس لیے شین سین میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا۔

کوئی لفظ تو ایسا بھی ہوتا جس کے لیے اسے جبڑوں پر دو تین بار زور ڈالنا پڑتا جیسے دھکا سٹارٹ گاڑی کے لیے لگایا جاتا ہے۔ کسی کے سامنے جب ایسا ہوتا تو اسے خاصی شرمندگی اٹھانا پڑتی، وہ کوشش کرتا کہ کم سے کم بات کرے۔ ایک بات وہ اکثر سوچتا کہ زبان سے تو اس کی کبھی بھی دوستی نہیں رہی۔ کبھی کبھی تو اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ زبان کٹوا کر ہاتھ پاؤں کے اشاروں سے باتیں کرے۔ اسے یوں لگتا کہ جیسے یہ زبان ہی تمام تکالیف کی جڑ ہے۔ پہلی مرتبہ اسے اس گڑبڑ کا احساس تب ہوا جب وہ چوتھی پانچویں میں پڑھتا تھا۔ اسکول سے پڑھ کر جب وہ اپنے نئے بستے اور نئی کتابوں کے ساتھ گھر آتا تو اسے اپنی ماں اجنبی سی معلوم ہوتی۔ ایک طرف اس کی اسکول کی مس، اسکول کے دوست یار تھے اور دوسری طرف ماں۔ اسے اب اپنے دیہاتی ددھیالی بھی بڑے غریب سے معلوم ہوتے جو اس کی مادری زبان میں بات کرتے۔ اس وقت اس ہلکے ہلکے احساس کو ابھی لفظ نہ ملے تھے۔ اسے گڑبڑ کا احساس تو ہوتا مگر ایسا کیوں ہے، کا جواب نہ ملتا۔

وہ اپنے باقی کلاس فیلوز سے پوچھتا: ''ساجد تم گھر میں کیا بولتے ہو؟'' ''ہم تو سارے ہی اردو بولتے ہیں''۔ اسے معلوم ہوتا کہ ساجد جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ خود بھی ایسا ہی کرتا۔ باتوں باتوں میں اگر کسی دوست کے منہ سے اردو بولتے پنجابی کا لفظ نکل جاتا تو سب مل کر اس کا مذاق اُڑاتے۔ جب وہ بڑا ہوا تو زبان کے چکر بھی بڑھتے چلے گئے۔ اسے اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔ اسے اپنے رشتہ دار بھی اچھے لگتے تھے مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ یہ کیسی خلیج ہے جس کے ایک طرف تو اس کے استاد، دوست یار اور اسکول کی پڑھائی ہے اور دوسری طرف اس کے گھر

والے۔ وہ گھر پر ہوتا تو اسکول اس سے دور ہو جاتا اور اسکول میں ہوتا تو اسے یوں لگتا جیسے گھر کہیں دور رہ گیا ہے۔ اس کی عمر بڑھتی گئی۔ وقت گزرتا گیا۔ زبان کی گرہیں جیسے مزید بڑھ گئیں۔ جب وہ میٹرک کرنے کے بعد کالج جانے لگا تو اس کے دل کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی سوچنے لگا۔ اسے دیہات کے ساتھ ساتھ شہر بھی سمجھ آنے لگا۔ اس کے نفسیات کے استاد اسلم صاحب نے اس کو مزید پختہ کر دیا۔ ایک جیسے لوگوں کی چار خانوں میں تقسیم اور ہر خانے کی اپنی زبان۔ کوئی ایک جانب اور کوئی دوسری جانب۔ لوگوں میں ایک عجیب قسم کی تفریق۔ ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے بھی دُور دُور۔ ایک جیسے لوگ۔ ایک جیسی ماں بولی ہونے کے باوجود ہر شخص کی اپنی زبان۔۔۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا اور سمجھتا رہا۔ اب اسے یوں لگنے لگا جیسے یہ زبان صرف زبان ہی نہیں بلکہ ایک مجبوری ہے۔ ماں سے پیار کرنے کی فرصت تو کسی کے پاس نہیں۔ اسے بہت سے دانشور ایسے معلوم ہوتے جیسے تہہ اندر تہہ ایک جھوٹے سچ کی تلقین کر رہے ہوں۔

اسے اپنا آپ بھی ہوا میں لٹکتا محسوس ہوتا۔ اس کے علم نے اسے تنہا کر ڈالا تھا۔ اسے بعض اوقات اپنے گھر کی ایک دوسرے میں پیوست گلیاں سانس بند کرتی محسوس ہوتیں۔ ہر شخص اسے وہ کہتا محسوس ہوتا جو شاید وہ کہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی یہ الجھن ایک دوسرے دوست کو بتائی۔ کہنے لگا: ''یار دیکھنا، یہ کیا چکر ہے؟ میں اپنے وجود کو بکھرا بکھرا سا محسوس کرتا ہوں۔ میں اپنے گاؤں میں ہوتا ہوں نہ گھر میں، نہ شہر میں۔ اس اندھی تقسیم میں اپنے آپ کو تو کسی کونے میں دکھائی نہیں دیتا''۔ دوست بولا ''گولی مار۔۔ گاؤں، شہر، لوگ۔۔۔ یہ سب فضول ہے۔ یہاں کچھ نہیں پڑا۔ یہاں سے نکلو۔۔ دنیا دیکھو۔ گھومو، پھرو''۔ مقصود چپ ہو گیا۔ آج بھی وہ سارا دن یہی سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کسی خانے میں فٹ ہونا ہے یا ولایت جانا ہے۔ شام کو وہ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خاتون کمپیئر کہہ رہی تھی: ''ہمیں اپنے علاقے اور ثقافت کی حفاظت کرنی چاہیے۔ یہ ہماری بنیادیں ہیں۔ جب تک یہ ہمارے آج میں شامل نہیں ہوں گے، کل کی بات نہیں ہو سکتی''۔

مقصود کے تن بدن میں تو جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے ٹی وی اٹھا کر زمین پر پٹخا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اسد طارق اسد

کھٹّے انگور

درج ذیل مضمون حقیقی واقعے کی منظر کشی نہیں کرتا اور تمام مذکورہ کردار، مع متکلّم، آج کل کے لڑکوں کے ذہنوں میں بسنے والی ایک عام سی رائے کی عکاسی ہے، جس کا ذکر اور وجود میں نے بذاتِ خود سُنا اور محسوس کیا ہے۔

مَیں اکیلا کیفیٹریا میں، ہاتھ میں پانی کی ایک بوتل تھامے، سیڑھیوں کے کنارے اپنی ذات اور زندگی کی الجھنوں میں کھویا ہوا بیٹھا تھا۔ کیا ہوا، کیوں ہوا اور کیا ہوگا جیسے کئی سوالات سے گِھرا ہوا میرا ذہن، اُس دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ میں پانچ بجنے کا انتظار کر رہا تھا، مگر بہت پشیمان تھا کہ یہ دو گھنٹے، بتیس مِنٹ کیسے گزریں گے۔ ایسے میں، مَیں ہر چند سیکنڈ بعد ایک دو گھونٹ پانی پی کر اپنا جی بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میری نظر میری سوچ و فکر سے پریشان اِدھر اُدھر میرا دھیان بدلنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ بس ایسے ہی گھومتے گھومتے میری نظر آخر ایک ایسے منظر پر آکے ٹھہر گئی۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر چار طلباء کا ایک گروہ آ کھڑا ہوا۔ اِس گروہ میں دو حضرات اور خواتین تھیں۔ حضرات میں سے ایک نوجوان جس کا نام جمیل تھا، بہت خوب رو تھا۔ اونچا قد، چوڑی چھاتی اور یہی نہیں داڑھی بھی کچھ بڑھا رکھی تھی جو اُس کے گورے رنگ پر بہت نمایاں تھی۔ دوسرے صاحب بظاہر تو ان کے دوست نظر آرہے تھے اور دیکھنے میں بھی اچھے بھلے معلوم ہوتے تھے، اپنے خوب رو دوست جمیل کے سامنے بہت پھیکے پڑ رہے تھے، اور اس بات کا احساس کچھ نہ کچھ اُن کے چہرے سے بھی واضح تھا، مگر آس پاس موجود کسی بھی شخص کو ان کی اس بے چینی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ان کا نام صغیر تھا۔

ساتھ کھڑی دونوں خواتین کی حالت بڑی دلچسپ اور دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں کی دونوں خوبرو نوجوان کے ڈیل ڈول سے بے پناہ متاثر تھیں، مگر وہ بڑی دل کشی سے اپنی اِس بے قراری کو پردے میں اوڑھے ہوئے بس مسکرائے جا رہی تھیں۔ وہاں نوجوان ایک فقرہ کستا اور جیسے ہی اُس کی داڑھی سے بے پرواہ سی مسکراہٹ جھلکتی، دونوں خواتین کے قہقہوں کی ایک قطار لگ جاتی جیسے کسی غریب سے محلے میں اچانک کہیں سے مُفت راشن والی گاڑی آ کر کھڑی ہو جائے۔ ایسے ہی ایک موقع پر دوسرے صاحب اپنی جیب سے کالا چشمہ نکال کر اپنی ناک پر رکھتے اور اِتراتے تو خواتین کی کچھ توجہ اُن کی طرف ہو تو جاتی، مگر خوبرو نوجوان پھر کوئی دلچسپ فقرہ پھینکتے اور پھر سے غور و فکر کا مرکز بن جاتے، اور صغیر صاحب ایک سگریٹ جلا کر جمیل کو پیش کرتے اور ایک سے خود بھی کش لگا لیتے اور اپنے دل کے زخموں کے درد کو دھوئیں کے ساتھ پھونکنے لگتے۔

اِس منظر کی سب سے دلچسپ اور قابلِ غور بات یہ تھی کہ جمیل اِس پوری

صورت حال سے بخوبی واقف تھا اور بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کو اپنی ذات پر بہت اعتماد تھا اور فخر بھی۔ اُن کا بار بار اترانا، کبھی جسم کو اکڑانا، کبھی بے وجہ انگڑائیاں لینا اِس بات کا ثبوت تھا کہ اُن کو وہاں موجود لوگوں کی توجہ کا ایک شوق سا تھا۔ اُس کا اسٹائل سے سگریٹ پھونکنا، بالوں سے کھیلنا اور مسکرانا کسی حد تک بناوٹی معلوم ہوتا تھا۔

میرا ذہن جو پہلے ہی مجھے الجھانے میں مصروف تھا، اب مجھے ستانے کا ایک اور زاویہ بنا چکا تھا۔ میں جہاں کن اکھیوں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا، وہیں میرا دل کچھ جلنے سا لگا۔ مانا کہ انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ بس دور کے ڈھول سُہانے لگتے ہیں، مگر بات اتنی نہیں تھی۔ یہ ڈھول واقعتاً سُہانا تھا۔ میں کسی بھی صورت کوئی ایسا معیار نہیں ڈھونڈ پا رہا تھا کہ کوئی بھی لڑکی جمیل سے متاثر نہ ہو۔ اسی سوچ میں اپنے قریب نصب شدہ شیشے کے دروازے میں اپنا جائزہ لیا۔ اپنے عکس کا یہی کمال رہا ہے کہ یہ کبھی دل رکھنے کو بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ''اپنی شکل دیکھی ہے؟'' سے شروع ہو کر میرے عکس نے وہیں بیٹھے بیٹھے کچھ ہی لمحوں میں ایسی کھری کھری سنائیں کہ دماغ سیدھا ہو گیا اور میں نے اپنی نظر اس عکس پر سے ہٹا لی۔

اب مَیں ایک بار پھر اُسی منظر کو دیکھ رہا تھا، مگر اب میرے نظریے میں فرق تھا۔ اُس عکس نے میرے دل کے آئینے پر دراڑ کی ایک ایسی لکیر کھینچ دی کہ اب میری نظر جمیل سے نفرت کرنے کے معیار تشکیل کرنے لگی تھی۔ اُس کی آنکھوں کا غرور، طبیعت کی مستی، نیّت کی غلاظت، سگریٹ کا دھواں، وہ سب نقص جو پہلے واضح نہیں تھے، اب صاف دِکھائی دینے لگے تھے۔ اِن چند منٹوں میں مَیں ایک انسان سے بغیر کسی وجہ کے نفرت کرنے لگا تھا۔۔۔ ایک ایسا انسان جو شاید میرا دوست بھی ہو سکتا تھا۔ خیر اُس کے دوست صغیر کی حالت دیکھ کر میں نے شکر ہی کیا کہ اِس سے تو مَیں ایسے ہی بہتر ہوں۔ انسان کو پرکھنے کا ایک ایسا پیمانہ میں ایجاد کر چکا تھا کہ اپنے ماضی سے جو بھی مثال اُٹھاتا تو وہ صحیح بیٹھ جاتی۔ اب اِسی سے میرے تاریک ماضی کا اندازہ لگا لیجئے کہ میں مشکل ہی سے ایسی کوئی مثال ڈھونڈ پایا ہوں کہ طبیعت کے شریف اور بھلے لڑکوں کو لڑکیاں زیادہ خاطر میں لاتی ہوں۔ اِس تجزیے سے ہرگز یہ مُراد نہیں کہ ہر کوئی ایسا ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ ایسا کوئی سلسلہ شاید میری نظر سے گزرا ہی نہیں۔

میرا ذہن اب تک تھکا نہیں تھا، ایک غیر کی ذات کی نکتہ چینی میں مشغول تھا، اُس بے چارے میں کچھ ایک سو ایک برائیاں نکال چُکا تھا، مگر میرا دل ہار چکا تھا۔ مَیں نے اِس امید میں گھڑی کی طرف دیکھا کہ شاید میرا مُقدر ہی مجھے اب یہاں سے لے جائے، مگر ابھی بھی بس چار ہی بجے تھے لیکن میرے ریزہ ریزہ سے وجود نے مجھے وہاں ٹھہرنے نہ دیا اور میں ایک طرف جمیل کو اب تنقید کی نظر سے دیکھنے لگا تھا، وہیں میں اپنے دل پر پڑی اُس لکیر کی چبھن لئے اُٹھا اور چل دیا۔ یہ ایک اچھا فیصلہ ثابت ہوا۔ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل کے مصداق جیسے جیسے کیفے ٹیریا سے دور ہوتا گیا، ویسے ویسے میرے دل اور دماغ سے جمیل اور اس کے رفقاء کا اثر بھی زائل ہوتا گیا۔ الحمدللہ!

فاروق کیانی، RCMS

نظمیں

لرزاں کس کے خیال کا آنچل ہے
کہ مدت کے بعد دل میں ہلچل ہے

ہوائیں تیرے چہرے کو چوم رہی ہیں
اور رقص میں بادل بھی شامل ہے

دل کی دھڑکنوں کے مل جانے میں
تامل مجھے ہے یا تجھ کو تامل ہے

میرے بس میں ہو تو خود کو روک لوں
پر میرے قابو میں کہاں مرا دل ہے

بارش کی خواہش میں صحرا کی ریت
نہ جانے کتنے سراب تخلیق کرتی ہے

اتنی سرپھری ہے سچ کو پانے کی تمنا
مومن کو ملحد و زندیق کرتی ہے

اور کوئی زیاں نہیں محبت کے سفر میں
محبت اپنی ذات کی تفریق کرتی ہے

میرے دشمن کے تخیل امن سے ڈر لگتا ہے
بہیمانہ تشدد کو جو طریق کرتی ہے

دل موسم کی بات ہے ساری

پاگل دل کو کیا سمجھائیں
پت جھڑ میں پھول کھلا دیتا ہے
ہجر میں خواب دکھا دیتا ہے

ساون رُت میں نہ ہو "گُل" تو
ہر سُو آگ لگا دیتا ہے

شاخ سے پتے گرنے کا موسم
بھری بہار میں سجا دیتا ہے

دل موسم کی بات ہی کیا ہے
پاگل دل کو کیا سمجھائیں

محمد حفیظ اللہ، NICE

تُم ہی ہو

خوشبو جس پھول کی ہر سُو مہکتی جاتی ہے
دیکھ کر پھر جسے چڑیا چہچہاتی جاتی ہے
جس کی انگڑائی پہ یہ باغ رشک کرتا ہے
جس سے بیٹھا یہ باغبان بھی عشق کرتا ہے
وہ مہکتا ہوا گلاب تُم ہو

جس کے ہر لفظ سے موتی بکھرتے جاتے ہیں
رونے والے بھی جسے پڑھ کے مسکراتے ہیں
شاعری جس کی یہ بلبل بھی گنگناتی ہے
جس کے لفظوں کو بس عاشق ہی سمجھ پاتا ہے
وہ محبت بھری کتاب تم ہی ہو

جس کے آتے ہی سب تاریکی چلی جاتی ہے
جس کی کرنوں سے ہر اِک شے چمکتی جاتی ہے
پیار میں جس کی یہ تارے بھی ڈوب جاتے ہیں
نگاہیں ہم بھی جسے دیکھ کر جُھکاتے ہیں
وہ روشن سا آفتاب تُم ہو

میری تنہائی میں جو ساتھ میرے رہتا ہے
میرا ہر دُکھ میرا ہر درد سنگ سہتا ہے
تمام دِن جسے میں سوچتا ہی رہتا ہوں
میں ساری رات جسے دیکھتا ہی رہتا ہوں
وہ اکلوتا میرا خواب تُم ہو

سنو:
میری ہر صبح کا آغاز تُم ہو
سُروں میں بکھرتا ہوا ساز تُم ہو
جو مُجھ میں گونجے وہ آواز تُم ہو
چُھپا ہے مجھ میں جو اِک راز تُم ہو

صفدر علی، SCME

متحرک ادب

ادب کسی بھی معاشرے کا عکس ہوتا ہے وہ شاعری ہو، ڈرامہ یا نثر مگر میں جس ادب کا ذکر کرنے جا رہا ہوں اُس سے بہتر آئینہ مُجھے آج تک نظر نہیں آیا۔ یہ ایسا ادب ہے جو لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کو محظوظ کرتا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ پتا نہیں میں نے کوئی نئ ادبی صنف دریافت کر لی ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کچھ ٹھیک سوچ رہے ہوں۔

لیکن یہ ایک ایسا ادب ہے جسے آپ ہر ٹرک، بس، رکشہ، کار، ٹیکسی وغیرہ کے پیچھے لکھا ہوا پائیں گے، جس سے نہ صرف آپ کو ٹرک، بس یا کار والے کے ادبی ذوق کا اندازہ ہوگا بلکہ اُس کا خاندانی پس منظر اور رہن سہن یک دم آپ کے سامنے آ جائے گا، مثلاً اگر ٹرک کے پیچھے لکھا ہو:

"کبھی کچلاگ گلونہ"

تو گھبرایئے مت۔ ڈرائیور صرف آپ کو کچلاگ آنے کی دعوت دے رہا ہے۔ یعنی وہ پشتون ہے اور بلوچستان میں کچلاگ کا رہنے والا بھی۔

"پاس کر یا برداشت کر"

یہ ایسے پُرانے ٹرکوں، ٹرالوں وغیرہ کے پیچھے لکھا ہوتا ہے جن کی طبعی عُمر پُوری ہو چکی ہوتی ہے اور اعلانیہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ:

"تجھے اٹھکیلیاں سُوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"

اگر ٹرک کا پینٹ نیا ہے تو اکثر آپ دیکھیں گے کہ لکھا ہوتا ہے:

"جلو مت کالے ہو جاؤ گے"

مزے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے ٹرک وافر مقدار میں انتہائی سیاہ قسم کا دھواں چھوڑ رہے ہوتے ہیں، جس سے آپ کا منہ کالا ہو نہ ہو، آپ کے کپڑے ضرور کالے ہو جائیں گے۔

اکثر 800 سی سی سوزوکی پر لکھا ہوگا کہ میں بھی بڑی ہو کر پراڈو بنوں گی اور سب سے زیادہ دُکھی اشعار اور جملے جس میں پردیس کا عنصر زیادہ ہو، ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہوتے ہیں مگر اِن پند و نصائح کی حقیقت تو آپ پر فوراً واضح ہو جاتی ہے، جب آپ دیہی رُوٹ کی بس پر سوار ہوتے ہیں تو دروازے کے سامنے ہی جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے بسم اللہ پڑھ کر سوار ہوں۔ ہوسکتا ہے یہ آپ کی زندگی کا آخری سفر ہو۔ لہٰذا سوار ہوتے ہی موت کا خوف بھی آپ پر سوار ہو جاتا ہے۔ لیکن جونہی بس آہیں بھرتی چلتی ہے آپ کو اِس پر یقین آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور خدا پر یقین تو مزید پُختہ ہو جاتا ہے۔ جب ایسی بس جس پر لکھا ہو:

"نہ انجن کی خوبی نہ کمالِ ڈرائیور
خدا کے سہارے چلی جا رہی ہے"

آپ کو لے کر منزل مُراد پر پہنچ جائے لیکن اس وقت تک اگر آپ کی ہڈیاں چٹخنا شروع ہو جائیں تو اس میں بس کا دوش نہیں اس کے تو اپنے سارے پُرزے با آواز بلند چیخ رہے ہوتے ہیں۔

مزید براں اگر ٹرک کے پیچھے ایوب خان یا مسرت شاہین کی تصویر ہے تو لامحالہ اِس کا تعلق شمال سے ہے۔ بیل کا تعلق چکوال یعنی پوٹھوہار سے چکور بلوچستان کی نشانی ہے۔ اسی طرح کسی بس کے عَقب میں اگر جٹ، گجر یا راجپوت طیارہ لکھا نظر آ جائے تو سمجھ لیں کہ یہ بس گجرات گوجرانوالہ یا سیالکوٹ جائے گی۔ کیونکہ یہ تینوں قبیلے تقریباً اسی علاقے میں بس کو طیارہ بنانے میں مصروف ہیں۔

صفدر علی، SCME

چاچو کی ڈائری

جب آپ کے بال نیم سفید ہوں اور آپ زندگی کی بہار کے موسم کو تقریباً خیر باد کہہ چکے ہوں تو بچے آپ کو چاچو اور اگر پتلون پہنے ہوئے ہیں تو انکل کہہ کر پکارتے ہیں اور اگر دو چار ویہلے (یعنی فارغ) نوجوان آپ کے قابو آ جائیں تو ایسی لمبی لمبی چھوڑتے ہیں جیسے سکندر اعظم کے لشکر کو ہندوستان کا راستہ انہوں نے ہی بتایا ہو۔ اور اُس کے گھوڑے کے آگے نشاندار بن کر مارچ کرتے رہے ہوں۔ یا آپ کی دعوت پر ہی وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا ہو۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ہماری تاریخ بھی کچھ اسی قسم کی ہے یعنی سکندر صاحب مقدُونیہ سے چلا دُنیا فتح کرنے نکلا اور قتل و غارت کرتا ہندوستان پُہنچا۔ لیکن ہم سکندر اعظم کی اِس طرح تعریف کرتے ہیں جس طرح کہ وہ مقدونیہ کا نہ ہو بلکہ بڑے تایا کا بیٹا ہو۔ اگر فاصلے کا حساب کیا جائے اور جتنے یونانی راستے میں تھکن سے رہ گئے اور مر گئے یا جنگوں میں کام آئے تو جہلم تک پہنچتے پہنچتے صرف سکندر، اِس کا گھوڑا اور باورچی ہی رہ جانا چاہیے تھا۔ مگر ہماری فیاضی طبع دیکھو کہ سکندر اِتنا فیاض تھا کہ پورس کے ایک فقرے پر اتنا خوش ہوا کہ فتح شدہ ریاست اُسے واپس کر دی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ اِتنے ہی تفریحی دورے پر نکلا ہوا تھا تو اُسے اتنی غارت گری کی کیا ضرورت تھی۔ ہم چونکہ مسلمان ہیں لہٰذا راجہ پورس کی بے عزتی کرنا ہمارا فرض ہے ورنہ حقیقتاً سکندر کی فوج اتنا تھک چُکی تھی کہ اُنہوں نے راجہ پورس کی فوج سے لڑنے سے معذرت کر لی تھی اور سکندر صاحب سے پورس کی لڑائی ہی نہ ہوئی تھی۔ سکندر دوسری جگہ غالباً مُلتان میں تیر سے زخمی ہوا اور اُس کی رُوح اوپر اور جسم نیچے چلا گیا تھا۔

مغلوں نے بھی اپنی تاریخ خود ہی لکھوائی تھی۔ ویسے تو جو بھی فاتح ہوتا ہے وہ اپنے منشیوں سے خود ہی اپنی تاریخ لکھواتا ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جو وہ لکھواتے رہے ہیں وہ صرف چولیں تھی۔ یعنی یورپ میں جب صنعتی انقلاب برپا ہو رہا تھا اور یونیورسٹیاں بن رہی تھیں تو ہندوستان میں اس وقت کے ولی عہد اور شہنشاہ کے درمیان ایک ناچنے والی مسمات انارکلی کے حصول پر لشکر کشی ہو رہی تھی۔ جب رائٹ برادرز ہوائی جہاز بنانے میں مصروف تھے، اس وقت مُغلیہ سلطنت کے ہونہار باہمی لڑائیوں کی وجہ سے اپنی طاقت کھو چُکے تھے اور میدانِ جنگ میں جانے یا اپنی سلطنت کی دیکھ بھال کی بجائے صرف میر درد، میر تقی میر اور غالب کے دیوان سے محظوظ ہو رہے تھے۔ کسی کے جگر میں درد تھا تو کسی کی کمر میں۔

اورنگزیب عالمگیر جنہیں کچھ لوگ ولی اللہ کا درجہ دینے پر تُلے ہوئے ہیں ہاتھ سے ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید لکھ کر گزارا کرنے لگا۔ بندہ پُوچھے اگر یہی کچھ کرنا تھا اور اگر یہ سب کچھ کر ہی لیا تھا تو پھر رعایا کی خدمت بھی کر

لیتے۔سکول، ہسپتال، سڑکیں اور سرائے بنواتے مگر شہنشاہِ ہندوستان نے سلطنت کو اتنا کمزور کر دیا کہ راجاؤں اور نوابوں نے ٹیکس دینا بند کر دیا۔ جس سے شاہی باورچی خانے کا خرچہ اور خواجہ سراؤں کے نخرے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔شہنشاہ ہندوستان ٹوپیاں بنا بنا کر گزر بسر کرنے لگا۔ بغیر تنخواہ کے فوجی اپنے ہتھیاروں سے خود ہی اپنی تنخواہ وصول کرنے لگے اور خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو گئی۔انگریزوں نے انہی سپاہیوں کو معمولی تنخواہ دے کر مُغلوں کے خلاف استعمال کیا اور بادشاہ سلامت کو رنگون بھجوا دیا تاکہ اُجڑے دیار کو یاد کریں اور ہمارے دہلی اور لکھنؤ کے بانکے لہک لہک کر معزول شہنشاہ کی بے بسی کے اشعار پڑھ کر ثوابِ دارین حاصل کر سکیں۔

مسئلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا، حاکم جس طرح مرضی تاریخ لکھوالیں۔رقیب سچ بیان کر دیتے ہیں اور ہم اپنی تاریخ سے کچھ سیکھیں یا نہ سیکھیں رقیب رُوسیاہ ضرور سیکھ لیتا ہے، مثلاً نپولین نے فتوحات کے چکر میں اِتنی فوج تیار کر لی کہ مزید مہم جوئی کے بغیر وہ فرانس کو مع نپولین نِگل لیتی لہٰذا نپولین نے جانتے بُوجھتے کہ برفانی موسم کب شروع ہوتا ہے،روس پر حملہ کر دیا۔اپنی اضافی نفری سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور فرانس کو امن کا گہوارہ بنا دیا۔

یہی کام ہٹلر نے سرانجام دیا اور اپنی سپاہ کی بعد از جنگ چیرہ دستیوں بلکہ خرمستیوں سے جرمنی کو محفوظ بنا دیا۔ہم انہیں لاکھ ظالم کہیں مگر کام دونوں نے قومی مفاد میں سرانجام دیا۔